اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ
ماہنامہ
سخن دان
اسلام آباد
دسمبر 2021ء

اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ

دسمبر 2021ء ☆☆☆☆☆☆☆☆ شمارہ نمبر 08، جلد 01

ماہنامہ اسلام آباد

سرپرست

ڈاکٹر افتخار الحق

dr.iftikhar2011@gmail.com

مدیر

غلام مصطفیٰ دائم

gmdaaim133@gmail.com

ماہنامہ "سخن دان" کا برقی شمارہ (PDF) اسلام آباد سے کمپوز کروا کے غلام مصطفیٰ دائم نے آرکائیو، ٹیلی گرام اور فیس بک گروپ (کتب خانہ) پہ اپلوڈ کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشمولات

مضامین

افسانے

غزلیات

نظمیں

تراجم

خطوط

اداریہ

مدیر

ناقوس

سخن دان اپنے سفر کے پہلے پڑاؤ کی نصف منزل طے کر چکا ہے۔ موہوم جذبوں سے معریٰ، سچائی اور ادراک کے باہمی سنجوگ سے عبارت "سخن دان"، محض دعووں کی خستہ دیواروں پہ اونگھنے والا کوئی تھکا ہوا سایہ نہیں ہے کہ اس میں ہلکی سی شعاع بھی شکن ڈال دے۔ بلکہ "سخن دان" ایک ایسے بارِ دوش کے ساتھ جذبۂ جمال کی تمام معنویتوں کی نگہبانی کرنے نکلا ہے جسے اٹھانا راہیوں کے لیے خوش آئند تجربہ ثابت ہو رہا ہے۔

اچھا ادب انسانی ماحول کا زائیدہ ہو، نہ ہو، انسانوں کے لیے مفید ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کے بعض اہم اور کلیدی حوائج کی تکمیل ادب کے دائرۂ تخلیق سے گزرے بغیر پوری نہیں سکتی۔ اظہار کسی بھی نوعیت کا ہو، اس کی اپنی شعریات ہوتی ہیں۔ جب تک انسانی فطرت کی ان ضرورتوں کو جنھیں محض زور وزر سے نہیں پورا کیا جا سکتا، ادب کے تقاضوں کے ذیل میں رکھ کر نہ پرکھا جائے، وہ خلیج بدستور قائم رہتی ہیں۔ کیونکہ ادب کے شعوری درجے سے اکتساب نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اظہار میں ادھورا پن رہ جاتا ہے۔ اظہار دراصل جذبِ قبول کا انعکاسی چہرہ ہے اور اس کے اہم تقاضوں کی تکمیل ادب کی روحانیت میں حل ہوئے بغیر نہیں مل سکتی۔ لہٰذا ادب اور انسان کا رشتہ فطری تناظر میں بھی اور تاریخی شعور کے پیشِ نظر بھی، بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔

اسی رشتے کی مبادیات میں "سخن دان" اپنا لہو رواں رکھنے کا عزم کر چکا ہے اور ادب کی قلمرو میں اپنے قدم جمانے کی بھرپور سعی میں مشغول ہے۔ دیکھیے! آخر یوسف کو خریدنے کی یاوری کس کے ہاتھ لگتی ہے؟

☆☆☆☆☆

سال 2021ء کے اختتامی ایام ہیں۔ "سخن دان" نئی امنگ اور تازہ جذبے کی مہمیز پر اپنے معیار کی کڑی پابندی کا عہد کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے گا۔ حالیہ مشمولات اسی معیار اور جمالیاتی ذوق کا واضح اشاریہ ہیں۔

رفتم که خار از پا کشم، محمل نهاں شد از نظر
یک لحظه غافل گشتم و صد ساله راهم دور شد

مولانا میرزا ملک محمد قمی (زادہٴ ۹۰۹ خورشیدی - درگذشتهٴ ۹۹۵ خورشیدی) معروف به ملک الکلام از شعرای سده یازدهم قم است

مضامین

ڈاکٹر افشاں ملک

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں فطرت اور کرداروں کے حسن کی عکّاسی

احمد ندیم قاسمی چونکہ ایک شاعر بھی ہیں اس لیے ان کے یہاں حسنِ بلاخیز اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ حسن کے یہ نظارے ان کے افسانوں کے ماحول کے علاوہ کرداروں میں بھی خوب خوب دیکھے جا سکتے ہیں۔ ویسے بھی ندیم قاسمی حسن کے شیدائی ہیں اور اپنی اسی شاعرانہ افتادِ طبع کے زیرِ اثر وہ افسانوں میں بھی شاعرانہ رنگ بکھیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں:

''میں جب چھت پر آیا ہوں تو چاند مغربی دھند میں یوں اٹک سا گیا تھا جیسے مکئی کے بھٹے کا چھلکا ہوا میں اڑتے اڑتے خم کھا کر جم جائے۔'' (افسانوی مجموعہ و افسانہ ''طلوع و غروب'')

''دھوپ نشہ آور تھی مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس وقت آسمان اتنا نیلا ہو رہا تھا جیسے اسے چھولو تو پوریں نیلی پڑ جائیں۔'' (افسانہ ''احسان'' افسانوی مجموعہ ''نیلا پتھر'')

''چاند ہمارے بالکل سامنے تھا، گول مول اور تندرست جیسے ابھی ابھی کسی نورانی جھیل میں ڈبکی لگا کر اچھلا ہو۔'' افسانہ ''نامرد'' افسانوی مجموعہ ''آنچل'')

''مٹیالا دیا، مخروطی لو جیسے جل پری تالاب کے کنارے کھڑی بال سکھا رہی ہو'' (افسانہ ''محدب شیشے میں سے'' افسانوی مجموعہ ''آبلے'')

فطرت کی حسن کاری سے احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ قاسمی فطری مناظر میں چاند، تارے، سورج، آسمان، بادل، بارش، پھول، جھرنے، تالاب، ندیاں، پگڈنڈیاں، وغیرہ کی منظر کشی اس شدت تاثر سے کرتے ہیں کہ قاری اس خوبصورت منظر کشی کے بیان محض سے ہی نہ صرف مسحور ہو جاتا ہے بلکہ وہ خود بھی ان تمام مناظر میں شریک ہو کر حسن کا متلاشی بن جاتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ فطری حسن کی ایسی پیش کش پریم چند کے یہاں مفقود ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ احمد ندیم قاسمی نے یہ حسن کاری صرف فطری مناظر کی مصوری میں ہی نہیں کی ہے بلکہ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے حسن کی کرشمہ سازیاں بھی اس شدّت سے بیان کرتے ہیں کہ قاری اس کے تاثر سے بچ نہیں پاتا۔ کچھ مثالیں دیکھیے:

''منظر کے ماند پڑتے ہوئے سنہری پن میں بانو بالکل غیر زمینی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ بالکل ان دیویوں کی تصویر جن کے گرد ہالہ بنا کر مصور ان کے نقوش کو صرف اس لیے دھندلا دیتے ہیں کہ آسمان کہیں وقت سے پہلے نہ ٹوٹ پڑے۔ بانو کا رخ مغرب کی طرف تھا جہاں سورج ڈوب چکا تھا اور اب اپنے لبادے کے سنہری اور سرخ گوشے لپیٹ رہا تھا۔ بجھتے ہوئے اجالے نے بانو کے نقوش کی دلربائی غیر یقینی حد تک بڑھا دی تھی۔'' (افسانہ ''جن وانس'' افسانوی مجموعہ ''برگ حنا'')

''مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل

کیا جاسکتا ہے جو اس انتہا کا حسن کار ہے۔‘‘(افسانہ ’’لارنس آف تھیلیبیا‘‘، مجموعہ: ’’کپاس کا پھول)
’’اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا، مگر نہیں۔ میں نے برف میں کوئی اور رنگ بھی ملا یا تھا۔ لالۂ صحرائی کا رنگ، شاید شفق شام کا رنگ، یا ممکن ہے۔‘‘(افسانہ ’’پہاڑوں کی برف‘‘ افسانوی مجموعہ ’’کپاس کا پھول‘‘)
’’اس کی آستین کہنی تک ہٹ جاتی تھی اور میلے ہاتھوں کے پیچھے اس کی کلائی کا صندل چمک چمک جاتا تھا۔‘‘(افسانہ ’’نصیب‘‘ افسانوی مجموعہ ’’برگ حنا‘‘)

انسانی حسن کی تصویر کشی کرتے ہوئے ندیم قاسمی سب سے زیادہ انسانی چہرے پر ’’آنکھوں‘‘ کو اہمیت دیتے ہیں۔ آنکھوں کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے کچھ یوں ہے:

’’انسان کے جسم کا سب سے بلیغ حصہ اس کی آنکھیں ہیں۔ جذبات کا اظہار ادھورا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی۔ لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔‘‘
’’بھکارن کی آنکھیں‘‘ میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو کسی گلابی دوا کے حلقے میں سجی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ چمک جو انتہائی پیار، یا انتہائی غصے یا انتہائی درد کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔‘‘(’’پہاڑوں کی برف‘‘ از مجموعہ: ’’کپاس کا پھول‘‘)

افسانہ ’’بھاڑا‘‘ میں ملکھاں جھیورن کی آنکھوں کا ذکر کس خوبصورت انداز سے کرتے ہیں:

’’میں نے اس کی آنکھوں کو اس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے ان میں دونوں جہان نظر آ گئے۔‘‘(افسانہ ’’بھاڑا‘‘ افسانوی مجموعہ ’’گھر سے گھر تک‘‘)
’’اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف ملکھاں کی آنکھیں بولتی رہیں۔ وہ کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی، کالی، سوچتی ہوئی آنکھیں جو کسی ملکہ کے چہرے پر ہوتیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں۔‘‘ (افسانہ ’’بھاڑا‘‘ افسانوی مجموعہ ’’گھر سے گھر تک‘‘)
’’تابندہ کی آنکھیں‘‘، یہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پھیلیں اور مجھے نگل گئیں۔ ان آنکھوں پر دنیا کے ساتوں سمندر قربان‘‘(افسانہ ہٰذا من فضل ربی‘‘ افسانوی مجموعہ ’’گھر سے گھر تک‘‘)
’’نوراں کی آنکھیں‘‘، میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں کتنے ہی چاندوں کے عکس تھے۔‘‘ (افسانہ ’’بدنام‘‘، افسانوی مجموعہ ’’بازار حیات‘‘)

احمد ندیم قاسمی کی حسن کاری اور فطری مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے شہلا شکور اپنے ایک مضمون مشمولہ احمد ندیم قاسمی نمبر ۱۹۹۶، عالمی اردو ادب دہلی، مرتب نند کشور وکرم صفحہ ۱۲۸ پر لکھتی ہیں:

’’ندیم جذبات کی کشمکش کو نمایاں کرنے یا معتدل بنانے کے لیے فطرت کی شادابی اور حسن کا سہارا لیتے ہیں۔ اس لیے کہ فطرت کا حسن انسان کی تکمیل بھی کرتا ہے اور اس کو قوت متخیلہ بھی عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فطرت انسان کے فطری اور انسانی جذبات کو نکھارتی بھی ہے۔ فطرت اور ماحول کی یہ شاعرانہ عکاسی ان کے افسانوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔‘‘

احمد ندیم قاسمی کے افسانے حسن کاری کے ساتھ ساتھ فنی دروبست سے بھی گتھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یا پھر واقعات کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے اکثر ایک ہی جملے کو بار بار دہراتے ہیں لیکن جملوں کی یہ تکرار بھدی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ندیم قاسمی کے فن کی انفرادیت کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے۔ جملوں کی اس طرح کی خوبصورت تکرار دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتی۔ احمد ندیم قاسمی کی یہ خصوصیت بھی انہیں ان کے ہم عصروں میں منفرد بناتی ہے۔ بطورِ مثال ملاحظہ فرمائیں:

''پیاس میری تلاش ہے اور زندگی ہے اور آخرت ہے اور میں اس وقت بھی پیاسا ہوں۔'' (''افسانہ ''میں انسان ہوں'' صفحہ ۹)

''آج ساری انسانیت پیاسی ہے اور میں بھی انسان ہوں، اس لیے میں بھی پیاسا ہوں۔'' (افسانہ ''میں انسان ہوں'' صفحہ ۱۰)

''اور میں زمین پر پڑا ہوں، اس لیے کہ میری بنیادیں کمزور تھیں، اس لیے کہ میں انسان ہوں اور میں پیاسا ہوں۔'' (افسانہ ''میں انسان ہوں'' صفحہ ۱۱)

''مجھے پانی کی تلاش ہے، مجھے ایک زندگی کی تلاش ہے مگر میری تلاش بیکار ہے، کیونکہ میں خدا کی محبوب ترین مخلوق ہوں، میں انسان ہوں۔'' (افسانہ ''میں انسان ہوں'' صفحہ ۲۲)

افسانہ ''دار ورسن'' میں اس جملے کی تکرار کئی جگہوں پر ہوئی ہے:

''ادھر تختہ کھسکا ادھر وہ جمّے کے بنائے ہوئے پھندے میں یوں لٹک گیا جیسے بیل سے توری۔'' (افسانہ ''دار ورسن''، صفحہ ۸۸)

''خیرو کی لاش رسّی سے یوں لٹک رہی تھی جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے۔'' (افسانہ ''دار و رسن''، صفحہ ۱۰۵)

افسانہ '' گڑیا'' میں:

''مگر آنکھیں کالی، بالکل بھک کالی ہوں۔'' (افسانہ '' گڑیا'' صفحہ ۹۴)

''نیلی آنکھوں کی جگہ کالی آنکھیں لگادیں بھک کالی آنکھیں۔'' (افسانہ ''گڑیا'' صفحہ ۹۸)

''اتنے گورے رنگ پر اتنی کالی آنکھیں۔ (افسانہ '' گڑیا'' صفحہ ۱۰۰)

''ماسی گل بانو'' میں:

''تاجو جب ذرا سی بڑی ہوئی تو اس کی آواز میں پیتل کی کٹوریاں بجنے لگیں۔'' (افسانہ ''ماسی گل بانو''، صفحہ ۱۷۰)

''تب پیتل کی کٹوریاں سی بجنے لگیں۔ زار زار روتی ہوئی تاجو دلہن کی رخصتی کے گیت گانے لگی۔'' (افسانہ ''ماسی گل بانو'' صفحہ ۱۷۶)

''پہاڑوں کی برف'' کے یہ جملے:

''اس پر مجھے لگا کہ وہ ہنسی ہے، نہایت مختصر مگر نہایت سریلی ہنسی۔ جیسے چینی کی پیالی کو چینی کی پیالی چھو جائے۔'' (افسانہ ''پہاڑوں کی برف'' صفحہ ۸۱)

''اور پھر چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجنے لگیں۔'' (افسانہ ''پہاڑوں کی برف'' صفحہ ۸۴)

''وہ بے اختیار چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجاتی دروازے میں سے نکل گئی۔'' (افسانہ ''پہاڑوں کی برف'' صفحہ ۸۲)

اس طرح احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ایک ہی جملے کی تکرار بعض اوقات ایک عجیب طرح کا حسن پیدا کرتی ہے۔ ایک جملے کو ایک ہی افسانے میں ایک سے زائد بار استعمال کر کے ربط باہم پیدا کرنا قاسمی کا ہی انفراد ہے۔

یوں تو بحیثیت افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی انفرادیت کے بہت سے پہلو ابھی ایسے ہیں جن پر اظہار خیال کرنے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن طوالت کے باعث فی الحال اختصار سے ہی کام لے رہی ہوں۔

خالد محمود سامٹیہ

مشتاق احمد یوسفی کے منتخب کرداروں کا نفسیاتی و غیر نفسیاتی مطالعہ

اردو نثر میں مزاح کی پہلی بڑی اور جاندار آواز خطوط غالب ہیں۔ غالب کی نثر میں پہلی بار اردو اپنی آزاد اور فطری روش پر قدم رکھتی ہے۔ جہاں عقل، جذبہ اور طرز اظہار تینوں میں فطری رنگ و آہنگ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ خطوط غالب کے بعد اردو طنز و مزاح کے میدان میں سب سے بڑا انقلابی اقدام لکھنؤ میں ''اودھ پنچ'' کے اجراء کا تھا۔ اودھ پنچ سے وابستہ مزاح نگاروں میں سرشار، ایڈیٹر منشی سجاد حسین، اکبر الٰہ آبادی، مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوق، منشی احمد علی کسمنڈوی، نواب سید محمد آزاد، تربھون ناتھ ہجر، عبدالغفور شہباز، جوالا پرشاد برق اور سید ممتاز حسین کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے سرشار بعد میں منشی نول کشور کے اخبار ''اودھ اخبار'' کے ایڈیٹر بن گئے تھے۔ ان مزاح نگاروں میں سب سے بڑا نام سرشار کا ہے جس نے ''فسانہ آزاد'' جیسا شاہ کار اردو ادب کو دیا۔ اردو مزاح میں سرشار کو اس لحاظ سے بھی اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے ''فسانہ آزاد'' کے ذریعے اردو ادب کو 'حاجی بدیع الزمان خوجی' اور 'آزاد' جیسے دو مضحک کردار دیے۔ یہ دونوں مزاحیہ کردار سرشار کے عہد کے دو متضاد تہذیبی و معاشرتی رویوں کے بہترین ترجمان ہیں۔

سرشار کے بعد منشی سجاد حسین مزاحیہ ادب کا ایک اور بڑا نام ہیں جنھوں نے ''حاجی بلغ العلیٰ بغلول المعروف بہ حاجی بغلول'' جیسا زندہ جاوید مضحک کردار تخلیق کر کے اردو کے مزاحیہ ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ان کے بعد مزاح کے میدان میں کئی بڑے ناموں کا اضافہ ہوتا ہے جن میں بطور خاص ملا رموزی، امتیاز علی تاج، مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی اور ابن انشا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کے بعد اردو کے ایک اہم مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کا نام آتا ہے۔ انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز قیام پاکستان کے بعد کیا۔ ان کا پہلا تخلیقی شاہکار۔ ''چراغ تلے'' کی صورت میں 1961ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت ہمارے ادب میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا تھی جس نے اردو کے مزاحیہ ادب کو ایک نئی راہ دکھائی۔ یوسفی کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے نئے نئے کردار تراشے۔ یہ سب کردار انہوں نے اپنے معاشرے سے لیے اور ان کی مضحک حرکتوں کو بالخصوص مزاح کا نشانہ بنایا۔

یوسفی چونکہ اول و آخر مزاح نگار ہیں اس لیے انھوں نے اپنے کرداروں کی اس انداز میں تعمیر و تشکیل نہیں کی جس طرح کی فکشن میں نظر آتی ہے۔ ان کے یہ کردار اپنے مضحک انداز زیست کے باعث ہمارے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ یوسفی کا کمال فن یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جن

سے ہماری اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ یوسفی نے ان کرداروں کی شخصیتوں کے ان مضحک پہلوؤں کو اہمیت دی ہے جو اکثر و بیشتر عام نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ تاہم یوسفی نے ان کرداروں کو کہیں بھی تضحیک کا نشانہ نہیں بنایا۔ آیئے اب یوسفی کے ان مضحک مگر دلچسپ اور حقیقی زندگی کے عکاس کرداروں سے ملتے ہیں۔

یوسفی نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران ان گنت مزاحیہ کردار تخلیق کیے ہیں یا یوں کہیے کہ ان کے کھٹ مٹھے مضامین کرداروں کا نگار خانہ ہیں۔ لیکن ان سب میں، سب سے اہم اور مرکزی کردار مرزا عبدالودود بیگ ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ کو یوسفی کے مزاح کے نظام شمسی میں سورج کی حیثیت حاصل ہے۔ جس طرح سورج کو اگر نظام شمسی سے نکال دیا جائے تو ہر سو تاریکی چھا جائے گی ایسے ہی اگر مرزا عبدالودود بیگ کو یوسفی کے کرداروں کے نگار خانے سے الگ کر دیا جائے تو ان کے مزاحیہ ادب کے تاج محل کی آب و تاب اور حسن گہنا جائے گا۔ مرزا 'اردو کے مزاحیہ ادب کا ایک شاہ کار اور زندہ جاوید کردار ہے، خصوصاً اس کردار کی تشکیل و تعمیر یوسفی نے خونِ جگر سے کی ہے۔ اسی لیے مرزا ان کا پسندیدہ کردار ہے۔

مرزا کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یوسفی نے اسے اپنا ہمزاد قرار دیا ہے اور ان کے اقبال، درازی عمر اور خوش بختی کی دل سے دعا دی ہے۔ چراغ تلے کے دیباچے میں مرزا کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''رخصت ہونے سے قبل مرزا عبدالودود بیگ کا تعارف کراتا جاؤں۔ یہ میرا ہمزاد ہے۔ دعا ہے خدا اس کی عمر و اقبال میں ترقی دے۔''

خود یوسفی کو بھی مرزا کا ہمدم، ہم راز و ہم زاد ہونے پر فخر ہے تاہم انھیں اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ وہ مرزا کی تہہ دار شخصیت کو تمام و کمال سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے :

> ''لوگ ہمیں مرزا کا ہمدم و ہمراز ہی نہیں، ہمزاد بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس یگانگت و تقرب کے باوجود ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ مرزا نے آلو اور ابوالکلام آزاد کو اول اول اپنی چڑ کیسے بنایا۔ نیز دونوں کو تہائی صدی سے ایک ہی بریکٹ میں کیوں بند کر رکھا ہے؟''

یوسفی نے مرزا کی شخصیت 'عادات و اطوار' پسند و ناپسند 'طرز بود و باش، سوچ و شعور اور رجحانات و تضادات بارے ہمیں تفصیل سے تو آگاہ نہیں کیا تاہم انہوں نے اپنی تصانیف میں مرزا بارے بعض اہم اشارے ضرور کیے ہیں جنھیں باہم ملا کر پڑھنے سے مرزا کی پر پیچ شخصیت کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مرزا کی یہی منتشر سوانح خمری یوسفی کی زبانی ملاحظہ کرتے ہیں:

> ''مرزا کو مبداءِ فیاض نے حد درجہ محتاط اور وہمی طبیعت ودیعت کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ انھیں آب حیات بھی پینا پڑے تو بغیر ابالے نہیں پئیں گے۔ مرزا نے چپ ہونا سیکھا ہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صحیح بات کو غلط موقع پر بے دغدغہ کہنے کی جو خداداد صلاحیت انہیں ودیعت ہوئی ہے وہ کچھ ایسی ہی تقریبوں میں کھلتی ہے۔ مرزا حسب معمول پھر بیچ میں کود پڑے۔ مرزا ایسا موقع کہاں خالی جانے دیتے تھے 'مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے' یاد رکھو، مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔
>
> مرزا کرتے وہی ہیں جو ان کا دل چاہے لیکن اس کی تاویل عجیب و غریب

کرتے ہیں۔ صحیح بات کو غلط دلائل سے ثابت کرنے کا یہ ناقابل رشک ملکہ شاذ و نادر ہی مردوں کے حصے میں آتا ہے۔ ہم نے اکثر یہی دیکھا کہ مرزا پیمبری لینے کو گئے اور آگ لے کر لوٹے۔ جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے۔ مرزا عبدالودود بیگ کو غبارے پنکچر کرنے کی بڑی بری عادت ہے۔ انہوں نے حسبِ عادت بس ایک لفظ پکڑ لیا۔ مرزا کو آج جو چیز پسند ہے 'کل وہ دل سے اتر جائے گی اور پرسوں تک یقیناً چڑ بن جائے گی۔

مرزا عبدالودود بیگ کی طرح یہ ہم سے آج تک نہ ہوا کہ اپنے تعصبات پر معقولات کا نیم چڑھا کر دوسروں کو اپنی بے لطفی میں برابر کا شریک بنانے کی کوشش کی ہو۔ مرزا بقول کسے 'غلط استدلال کے بادشاہ ہیں۔ ان کی حمایت و وکالت سے معقول سے معقول کاز نہایت لچر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے ہم سب انھیں تبلیغ دین اور حکومت کی حمایت سے باز رکھتے ہیں۔ ان کی ایک چڑ ہو تو بتائیں۔ مرزا کو کھانے کا ایسا ہوکا ہے کہ ایک منہ انہیں ہمیشہ ناکافی معلوم ہوتا ہے۔

بالخصوص دعوتوں میں سب سے پہلے پہنچتے اور سب کے بعد اٹھتے ہیں۔ اس انداز نشست و برخاست میں ایک کھلا فائدہ یہ دیکھا کہ وہ باری باری سب کی غیبت کر ڈالتے ہیں۔ ان کی کوئی نہیں کر پاتا۔ مرزا پر اب یہ جھک سوار تھی کہ اگر صندل کا گھسنا اور لگانا درد سر کے لیے مفید ہے تو اسے اگانا کہیں زیادہ مفید ہونا چاہیے۔

مرزا کی اس مختصر ترین سوانح خمری سے بھی مرزا کے بعض نفسی میلانات ورجحانات کا واضح اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ مرزا انتہادرجہ وہمی انسان تھے۔ ہر کام کرنے سے پہلے خوب چھان پھٹک کرتے تھے۔ ویسے تو کسی بھی کام کے آغاز سے پہلے مناسب منصوبہ بندی اور چھان پھٹک بہت اچھی بات ہے لیکن مرزا کچھ زیادہ ہی چھان پھٹک سے کام لیتے۔ انتہادرجے کے باتونی تھے۔ خاموش ہونا اور چپ رہنا ان کے مزاج میں شامل نہ تھا تاہم جب بھی بولتے بے سرا اور بے موقع بولتے۔

صحیح بات صحیح موقع پر کرنا مرزا نے کہیں سے سیکھا ہی نہیں تھا۔ بے صبرے تھے 'گفت گو کے پس منظر اور موقع محل کو سمجھے بغیر بیچ میں ہی کود پڑتے۔ کوئی بھی الجھن ہو، کوئی بھی مسئلہ ہو مرزا اپنی عجیب و غریب منطق کے ساتھ رائے دینا اور اس پر ڈٹ جانا اپنا فرض عین بلکہ مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ مرزا کی ایک بری عادت یہ بھی تھی کہ جس لفظ کو پکڑ لیتے پھر اس کی جان چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتے۔ پسند و ناپسند کا بھی عجب معیار تھا۔

جو چیز ایک لمحے پسند ہے دوسرے ہی لمحے اس سے سخت بیزاری بلکہ چڑ ہونے لگتی۔ مرزا ایسی پہلو دار شخصیت کے مالک تھے جسے یوسفی بھی مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ ہر لمحے گرگٹ کی مانند رنگ بدلتے تھے۔ ایک طرح سے مجموعہ اضداد تھے۔ کھانے کے تو رسیا تھے ہی لیکن یہاں بھی ان کا زاویہ نظر سب سے منفرد ہے۔ وہ کہا کرتے کہ 'کھانے کے لیے ایک منہ ناکافی ہے۔' مرزا غالب آموں کے شیدا تھے اور ان کی یہ بات مشہور تھی کہ آم میٹھے ہوں اور بے شمار ہوں۔

جبکہ مرزا کہا کرتے کہ کھانا تو بے شمار ہو ہی لیکن منہ بھی ایک سے زائد ہوں۔ مرزا کی ایک قبیح عادت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی غیبت کرنے میں بھی مشاق تھے اور اس گھٹیا فعل کو سرانجام دے کر ایک طرح کی مسرت محسوس کرتے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی کہ کوئی ان کے وار سے بچ نہ پائے۔ ان کی ایک بری بلکہ

خطرناک عادت یہ بھی تھی کہ جہاں بھی بیٹھتے آگ جلا کر ہی اٹھتے یعنی ان سے خیر کی امید نہیں تھی۔ یہ پہلو مرزا کی شخصیت کے منفی رخ کو پیش کرتے ہیں۔

تاہم مجموعی طور پر 'مرزا' یوسفی کا ایک شاہ کار کردار ہے جس سے یوسفی نے مزاح پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ کئی اہم کام لئے ہیں۔ جہاں یوسفی براہ راست کچھ نہیں کہ پاتے وہاں مرزا کی مدد سے کہ دیتے ہیں۔ جہاں کوئی بات غیر معمولی بے تکلفی سے اور کسی رو رعایت کے بغیر کہنی ہو 'مرزا' کے ذریعے کہ دیتے ہیں۔ اسی لیے یوسفی نے مرزا کے لیے ہر مضمون میں گنجائش پیدا کی ہے۔ مرزا کے اقوال فقط ہمیں محظوظ ہی نہیں کرتے بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ تفکر در حقیقت یوسفی کے اسلوب کی اساسی خصوصیت ہے۔ یوسفی کی یہی خصوصیت انہیں دوسرے مزاح نگاروں کی فہرست میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ خود یوسفی نے آصف فرخی کو اپنے انٹرویو میں کہا:

''میرا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مزاح کہ جو آپ کو سوچنے پر مجبور نہ کرے وہ ناپختہ ہے۔''

مرزا عبدالودود بیگ، یوسفی کا ایک متحرک، پہلودار اور زندہ جاوید کردار ہے۔ مرزا بظاہر مضحک کردار ہے لیکن یوسفی نے اس کے ذریعے بصیرت و فراست کی ایک سنجیدہ دنیا بھی دکھائی ہے۔ یوسفی نے جہاں بھی مرزا کی گنجائش پیدا کی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بس اسی کی ضرورت تھی۔ نیز یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ واحد کردار ہے جو موجودہ صورت حال سے صحیح طور پر نمٹ سکتا ہے۔ یہی تو ایک بڑے تخلیق کار کے قلم کا ایجاز ہوتا ہے۔ یوسفی نے اس کردار کے ذریعے مزاح کے پردے میں دراصل ہمارے قومی تعصبات اور معاشرتی رویوں پر گہرا طنز کیا ہے اور قوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا کے مزاح، حقیقت اور تفکر سے بھرپور چند فرمودات پڑھیے اور سر دھنیے:

☆ صاحب مرغی تو در کنار میں تو انڈے کو بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ تازہ خود کھائیے۔ گندے ہو جائیں تو ہوٹلوں اور سیاسی جلسوں کے لیے دگنے داموں بیچیے۔ (چراغ تلے، ص 115)

☆ بے پردگی کا خاص انتظام ہو گا ضرور آنا۔ (چراغ تلے، ص 140)

☆ مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نرالا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں ان کے فلسفہ حیات و ممات کا دخل ہے۔ بیماری کے فضائل ایسے دل نشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ صحت یاب ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ (چراغ تلے، ص 27)

☆ مرزا حسب معمول پھر بیچ میں کود پڑے۔ کہنے لگے 'دیکھ لینا! وہ دن دور نہیں جب کراچی میں مردے کو کھڑا گاڑنا پڑے گا اور نائیلون کے ریڈی میڈ کفن میں اوپر زپ لگے گی تاکہ منہ دیکھنے دکھانے میں آسانی رہے۔ (خاکم بدہن، ص 94)

☆ مرحوم کے ایک ہم جماعت نے اشاروں کنایوں میں بتایا جوانی میں اشتہاری امراض کا شکار ہو گئے۔ ادھیڑ عمر میں جنسی تونس میں مبتلا رہے۔ لیکن آخری ایام میں تقویٰ ہو گیا تھا۔ (خاکم بدہن، ص 98)

مرزا کے یہ شگفتہ چٹکلے کئی لحاظ سے اہم ہیں۔ ظاہری سطح پر ہمیں محظوظ تو کرتے ہی ہیں تاہم سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ یوسفی نے مزاح کے پردے میں کمال فنی مہارت سے ہمارے معاشرتی رویوں کا پردہ چاک کیا

ہے۔ مرزا ہمارے معاشرتی رویوں کا عکاس سچا اور کھرا کردار ہے۔ اسے جہاں کہیں کج روئی و کج ادائی نظر آتی ہے وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ وہ مزاح کے پیرائے میں اپنی رائے دیے بنا نہیں رہ سکتا۔ تاہم بعض اوقات اس کے لہجے اور گفت گو میں طنز اور تلخی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ''آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آ سکتا نہیں۔''

مرزا کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ جو کہتا ہے اس پر ڈٹ جاتا ہے۔ ضدی ہے، اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے مطابق وہ جو کہتا ہے وہی سچ ہے، اور اپنی غلط بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے عجب تاویلیں و دلیلیں پیش کرتا ہے۔ لیکن اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ اس لحاظ سے وہ شدید انا پرست ہے۔ اور اس کی یہی انا پرستی اسے اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹنے دیتی۔

> ''مرزا کرتے وہی ہیں جو ان کا دل چاہے لیکن اس کی تاویل عجیب و غریب کرتے ہیں۔ صحیح بات کو غلط دلائل سے ثابت کرنے کا یہ نا قابلِ رشک ملکہ شاذ و نادر ہی مردوں کے حصے میں آتا ہے۔''

یہ عیوب صرف مرزا کے عیوب نہیں ہیں بلکہ یہ ہمارے معاشرتی و تہذیبی عیوب ہیں۔ روزمرہ زندگی میں ہم ایسے بہت سے کرداروں اور افراد سے ملتے ہیں جو ایسی ہی معاشرتی ناہمواریوں کا شکار ہیں۔ مرزا صرف نامناسب اور مضحک باتیں کرنے کا ہی عادی نہیں ہے بلکہ وہ سنجیدہ گفتگو بھی کرتا ہے۔ وہ اپنی گفتگو کے دوران بعض اوقات ایسی انوکھی، نرالی اور دلچسپ تاویلیں پیش کرتا ہے کہ قاری چونک جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اچھا اس بات کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> ☆ کلامِ غالبؔ کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں، وہ نہ ہوں تو غالبؔ کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں غالبؔ واحد ایسا شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دوگنا مزا دیتا ہے۔ (آبِ گم)
>
> ☆ طوائف کو تھانے سے ''این او سی'' (نو ابجیکشن سرٹیفکیٹ) اس لیے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کر لے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جا رہی ہے 'وعظ سننے یا سیاست میں حصہ لینے تو نہیں جا رہی۔ (آبِ گم)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مرزا اس بات سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تندرستی نہیں بلکہ بیماری ہزار نعمت ہے۔ جبکہ تندرستی ام الخبائث اور تمام بداعمالیوں و بدکرداریوں اور فساد کی جڑ ہے۔ انسان بیمار ہو تو گناہوں، بداعمالیوں اور بدکاری و بدکرداری سے محفوظ رہتا ہے اور سب سے بڑھ کر شیطانی چالوں اور وسوسوں سے محفوظ رہتا ہے:

> ''وہ (مرزا) جب تندرستی کو ام الخبائث اور تمام جرائم کی جڑ قرار دیتے ہیں تو مجھے رہ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقی یافتہ ممالک میں تندرستی کی وبا عام ہے وہاں جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔''

ویسے مرزا کی دلیل کچھ غلط بھی نہیں۔

درحقیقت مشتاق یوسفی نے اپنے ہمزاد عبدالودود بیگ کے ذریعے 'ہم من حیث القوم جن کمزوریوں،

کوتاہیوں، اور خرابیوں وبداعمالیوں میں مبتلا ہیں' کو نہ صرف نشان زد کیا ہے بلکہ ہمدردانہ واصلاح کی بھی کوشش کی ہے۔ یوسفی نے دراصل مزاح کے پردے میں قوم کی اصلاح و فلاح کی مخلصانہ کاوش کی ہے۔ مرزا ہمارے معاشرے کا عکاس، نباض، متحرک اور نمائندہ کردار ہے۔ مرزا کی جو خوبیاں ہیں وہ درحقیقت ہماری خوبیاں ہیں اور مرزا کے عیوب دراصل ہمارے عیوب ہیں۔ مرزا ہمارے معاشرے کی نمائندہ آواز ہے۔

یوسفی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اردو میں سب سے پہلے ہمزاد کا کردار متعارف کرایا اور وہ بھی بھرپور انداز میں۔ ان سے قبل کسی دیگر مزاح نگار نے مزاح کے میدان میں 'ہمزاد' جیسا کردار تخلیق کر کے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم ان کے پیش روں میں پطرس بخاری نے غیر ارادی ولاشعوری طور پر 'میں' کی صورت میں اپنی تحریروں میں جو کردار پیش کیا وہ بھی ایک طرح کا 'ہمزاد' ہی ہے۔ لیکن انہوں نے اس کردار کی تشکیل یوسفی کے ہمزاد کی مانند نہیں کی۔ نا ہی انہوں نے دیگر کوئی بھرپور مزاحیہ کردار پیش کیا۔ یقیناً آغا (ہمزاد) ایسے کردار کی تخلیق کا کریڈٹ یوسفی کو جاتا ہے، ان کا کوئی ہم عصر یا پیش رو اس معاملے میں ان کا ثانی نہیں۔ گوہر رحمان نوید نے پطرس کے ہمزاد کے حوالے سے اپنی کتاب 'صوبہ سرحد میں اردو ادب' میں رائے دی ہے کہ :

> ''پطرس نے اپنے مضامین میں کوئی ایسا بھرپور مزاحیہ کردار پیش نہیں کیا جو اپنی فطری ناہمواریوں سے محفل کو زعفران زار بناتا چلا جاتا۔ تاہم اس نے'' میں'' کے پردے میں مصنف کے ہمزاد کا ایک ایسا کردار ضرور پیش کر دیا ہے جو مزاحیہ کردار سے قریبی مماثلت رکھتا ہے۔ بالعموم ایک اچھا مزاحیہ کردار اس قدر جاندار ہوتا ہے کہ اس کی ناہمواریوں کے بیان میں صورت واقعہ کی مضحک کیفیات ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں لیکن پطرس کے ہاں مزاحیہ کردار ابھرا ہوا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی''، ''میں ایک میاں ہوں''، ''مرید پور کا پیر''، ''مرحوم کی یاد میں'' اور بیشتر دوسرے مضامین میں مصنف کے ہمزاد کی ناہمواریاں دراصل صورت واقعہ کی مضحک کیفیات کو ابھارنے میں ایک حربے کا کام دیتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔''

یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یوسفی نے اردو کے باقاعدہ مزاح نگاروں میں سے جس مزاح نگار کے ساتھ اپنی ادبی شناخت قائم کی ہے، وہ بھی پطرس بخاری ہی ہیں۔ آصف فرخی کو اپنے انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ اردو کے سبھی مزاح لکھنے والے پسند ہیں لیکن پطرس کا کوئی ثانی نہیں :

> ''جہاں تک پسندیدگی کا تعلق ہے تو وہ تو سب پسند ہیں لیکن پطرس آج بھی ایسا ہے کہ کبھی گاڑی اٹک جاتی ہے تو اس کا ایک صفحہ کھولتے ہیں تو ذہن کی بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں اور قلم رواں ہو جاتا ہے۔ یہ پطرس میں بات ہے۔''

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ یوسفی کے تخلیقی شاہ کار اور ہمزاد کو ناقدین نے کس انداز میں دیکھا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی مرزا عبدالودود بیگ بارے لکھتے ہیں :

> ''یہ کردار ہماری بالکل روایت اور یوسفی صاحب کے تجربے کی چیز ہے 'وہ حماقتیں جو ہمارے معاشرے کی حقیقتیں ہیں، ان کے اندر اسی زور اور استقلال سے موجود ہیں جیسی کہ معاشرے میں ملتی ہیں۔''

ظہیر فتح پوری مرزا کو اردو کا زندہ جاوید مزاحیہ کردار قرار دیتے ہیں :

''رہے مرزا، سو وہ یقیناً ہمارے مزاحیہ کرداروں میں زندہ جاوید رہیں گے۔''

جبکہ عبداللہ شاہ نے مرزا کو لافانی کردار قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''مرزا، ان کا لافانی کردار ہے جس کا ذکر آتے ہی مسکراہٹیں جاگ اٹھتی ہیں۔''

آیئے اب مرزا عبدالودود بیگ کے بعد یوسفی کے ایک اور اہم اور مرکزی کردار پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے بی ٹی گولڈ میڈلسٹ سے ملتے ہیں۔ پروفیسر موصوف سے ہماری پہلے پہل ملاقات ''خاکم بدہن'' میں شامل خاکے ''پروفیسر'' کو پڑھتے ہوئے ہوتی ہے۔ یوسفی نے جس طرح 'پروفیسر' کا خاکہ اڑایا ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ یوسفی بڑی بے تکلفی کے ساتھ پروفیسر کو کبھی پروفیسر اور کبھی قاضی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب اپنے نام کے ساتھ بڑے فخر کے ساتھ ''گولڈ میڈلسٹ'' لکھتے ہیں۔

یوسفی، مرزا کی زبانی اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے ہمیں بتاتے ہیں کہ قاضی صاحب کو کسی جامعہ نے ان کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی پر گولڈ میڈل سے نہیں نوازا تھا بلکہ انہیں یہ طلائی تمغہ مڈل میں بلاناغہ حاضری پر ملا تھا۔ مرزا کی اس شگفتہ وضاحت سے پروفیسر کی تعلیمی قابلیت کی قلعی کھل جاتی ہے۔ پروفیسر موصوف کا تعارف کراتے ہوئے یوسفی لکھتے ہیں :

''دبنگ اور دلیر آدمی تھے اور خطرے سے ڈرنا یا بچنا تو کجا، بسا اوقات سانپ کو رسی سمجھ کر گتھ مرتے تھے۔ ان کی جرات اب شجاعت سے گزر کر تہور اور تہور سے گزر کر حماقت کی ماورائی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔ انہوں نے زندگی بھر زبان کے علاوہ کسی دوسرے عضو کو تکلیف نہیں دی تھی۔ درس وتدریس تو ایک حیلہ شرعی تھا' ورنہ بقول مولانا محمد حسین آزاد'' پروفیسر کا پیشہ توکل تھا اور بے دماغی سے اسے رونق دیتے تھے۔ کوئی شخص ان سے ملازمت، بحث یا برج میں سبقت لے جائے تو اس کے پورے صوبے سے نفرت ہو جاتی تھی۔

برصغیر پاک وہند کا کوئی صوبہ بچا ہو گا جس سے ان کی ذاتی عداوت نہ ہو۔ بلکہ اب تو چھوٹی چھوٹی تحصیلیں آنکھیں دکھانے لگی تھیں۔ اپنے پیشے سے تنگ آ چکے تھے اور کہتے تھے کہ تمھارا خیال آ جاتا ہے ورنہ اکثر جی میں آتا ہے کہ گھر کو آگ لگا کر کسی غیر آباد جزیرے میں ایک لوٹا' ڈور' فروٹ سالٹ اور دیوان غالبؔ لے کر چلا جاؤں۔ اگر میں ملک کا پرائم منسٹر ہوتا تو۔ تو یونیورسٹی میں نوکری نہیں کرتا۔''

یوسفی نے قاضی عبدالقدوس کے کردار کی تشکیل میں کئی فنی حربوں سے کام لیا ہے اور کئی طرح سے اس کے خاکے میں رنگ بھرے ہیں۔ قاضی عبدالقدوس ایک ایسا شخص ہے جو اپنے طرفہ کردار ومضحک واقعات سے مزاح کا نشانہ بنتا ہے۔ وہ ایک بھولا بھالا، تنگ نظر اور متعصب انسان ہے۔ پروفیسر جہاں اپنی سادہ لوحی سے مزاح پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے وہاں وہ ہر چیز اور ہر معاملے کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے کا عادی ہے۔

پروفیسر ایسے لوگوں سے شدید نفرت کرتا ہے جو مزاجاً اسے پسند نہیں یا جو لوگ کسی بھی سطح پر اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ پروفیسر کے جذبوں میں اعتدال اور دنیاوی سوجھ بوجھ کی خاصی کمی ہے۔ وہ صرف کسی شخص سے ہی نفرت نہیں کرتا بلکہ اس کے صوبے سے بھی نفرت کرنے لگتا ہے۔ ایک میٹنگ میں جامعہ کے وائس چانسلر کو 'شٹ اپ' کہنے کے بعد اخبار پڑھنا بھی فقط اس لیے ترک کر دیتا ہے کیوں کہ کبھی کبھار اخبار مذکور میں وی سی صاحب کا کوئی بیان شائع ہوتا رہتا ہے۔

جب پروفیسر موصوف کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک جونیئر کو جامعہ نے 1857ء میں دلی کے سودا بیچنے والوں کی آوازوں پر ریسرچ کرنے کے لئے سات سمندر پار لندن بھیج دیا ہے تو انہوں نے فوراً وی سی کو اپنا استعفیٰ بھجوا دیا کیوں کہ انہیں جامعہ کے اس اقدام سے شدید توہین محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا نامکمل تھیسس بعنوان ''چاکسو (خورد) کا دبستان شاعری'' بھی پھاڑ دیا۔

پروفیسر موصوف ایک SELFMADE انسان تھے۔ انہوں نے اپنی شخصیت میں کبھی کسی کو اصلاح کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن جب پروفیسر بنے تو اپنے دوست خاص مرزا عبدالودود بیگ کے مشورے سے اپنی شخصیت میں ایسی انقلابی تبدیلیاں کیں جو مزاح پیدا کرنے کا باعث بنیں۔ ''پروفیسر کے ابتدائی ایام میں جب لڑکے بالکل لڑکوں ہی کی سی حرکتیں کرنے لگے تو ہم سب نے صلاح دی کہ لب ولہجہ میں ڈپٹ اور شخصیت میں رعب داب پیدا کرو۔ دوسرے ہی دن انہوں نے جوتوں میں پون انچ موٹا تلا لگوا لیا اور اونچی باڑھ کی ٹوپی پہننی شروع کر دی' جس سے قد تو خیر کیا بڑھتا، البتہ خودی اتنی بلند ہو گئی کہ ہم نے انہیں بادشاہی مسجد کے دروازے سے بھی جھک کر نکلتے دیکھا۔

پروفیسر موصوف سیدھے سادے اور سادہ لوح انسان ہیں۔ وہ خود اپنی کوئی خاص سوچ نہیں رکھتے، تاہم انہیں نیک وبد کی کچھ نہ کچھ تمیز ضرور تھی اور وہ ان رنگوں کو بھی آسانی سے پہچان سکتے تھے جن کا تعلق نسوانی جلد سے ہو۔ جب انہوں نے بغیر سوچے سمجھے دوسروں کے مشوروں پر عمل کیا تو گویا 'کردار' سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے بلکہ بات یہاں تک پہنچی کہ ''شاہین خصلت اختیار کر لی تھی یعنی بار بار اپنے موضوع اور مخاطب پر'' جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا۔

پروفیسر صاحب کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ ہر وقت اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے رہتے۔ لیکن جب ان کا بینک آف چاکسو لمیٹڈ میں بطور ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز اینڈ ایڈورٹائزنگ تقرر ہوا تو کلین شیو ہو گئے تاہم ایک عرصے تک بے قرار و بے چین چٹکی سے اس جگہ کو تاؤ دیتے رہے جہاں کسی زمانے میں مونچھ ہوا کرتی تھی۔ بنک کی ملازمت جوائن کرنے سے ان کی شخصیت میں کئی خوش گوار تبدیلیاں آئیں:

> ''بنک میں افسری سے ان کے کندھوں کا پروفیسرانہ خم تو دور نہ ہوا، مگر بہت سی اور خوش گوار تبدیلیاں 'کچھ از خود کچھ اوروں کے کہنے سننے سے' ان کی شخصیت میں پیدا ہوتی چلی گئیں۔''

ان کے علاوہ ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، کھانے پینے کے طور اطوار میں بھی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ مثلاً:

> ''فرشی نشست کے بچپن سے عادی تھے۔ وہ ترک تو نہیں کی، لیکن اب گاؤ تکیے کا سہارا لے کر نہیں بیٹھتے تھے۔ اسے گود میں لے بیٹھتے تھے، مختصر یہ کہ پرسنیلٹی نکل آئی تھی۔''

زمانہ طالب علمی میں قاضی صاحب نے ایک مضمون بعنوان ''موازنہ ٹی ایس ایلیٹ و شیخ امام بخش ناسخ'' لکھا۔ اس مضمون میں گویا پروفیسر نے ممولے کو شہباز سے لڑانے کی کوشش کی۔ پروفیسر صاحب شروع شروع میں اس مضمون کا حوالہ بڑے فخر سے دیتے لیکن جب حقیقت آشکار ہوئی تو اس 'موازنہ' کو حتی الامکان چھپانے لگے تھے۔ تاہم ادبی رسائل کے مدیران کے ہاتھ گویا پروفیسر کی شہ رگ آ گئی تھی۔ مدیران اپنے رسائل کے لیے

اشتہارات حاصل کرنے کے لیے اس مضمون کے ذریعے پروفیسر کو بلیک میل کرتے اور پروفیسر بار بار بلیک میل ہوتے۔ تاہم پروفیسر صاحب مرد مدیران کی نسبت خواتین مدیران کو اشتہارات کے ذریعے نوازنے میں کچھ زیادہ ہی سخی اور فیاض تھے۔ بعض اوقات تو خواتین مدیران کو انٹرویو دینے ان کے گھر پہنچ جاتے۔ اس سخاوت کی ایک وجہ تو ان کا ابھی تک کنوارا پن تھا اور دوسری وجہ بقول یوسفی یہ تھی کہ:

''ہمارے ہیرو نے آج تک کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جس کو وہ ناپسند کر سکے۔
کنارے کو ترسا ہوا مانجھی ہر اتھلی کھاڑی میں لنگر ڈال دیتا ہے۔''

یہ یوسفی کے قلم کا اعجاز خاص ہے کہ وہ حقیقت کو مزاح کے پردے میں کمال خوش اسلوبی سے بیان کر دیتے ہیں۔

اب اسی رسالہ ''بازیچہ اطفال'' کی مدیرہ آنسہ سمنتا فرزوق ہی کو لے لیجیے۔ ان میں بظاہر کوئی ایسی خوبصورتی والی بات تو تھی نہیں لیکن پھر بھی ہمارے ہیرو اس پر دل و جان سے قربان ہو رہے تھے۔ اس کا ناک نقشہ یوسفی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''سفید شلوار، سفید قمیض، سفید دوپٹہ، سیدھی مانگ، ننگے ہاتھ، ننگے کان۔ اس
ناک نقشے میں ایسی کوئی دل پذیر دل کشی نہیں تھی جو کوئی دل دے بیٹھتا۔ تاہم دن
دیہاڑے ہمارے پروفیسر صاحب تو دل دے بیٹھے۔ اللہ جانتا ہے کہ وہ ''اشتہار نمبر'' پر
ریجھ گئے یا اس کی مدیرہ آنسہ سمنتا فرزوق کی تیغ آبرو سے برضا و رغبت ڈھیر ہوئے۔''

پروفیسر کی ایک شخصی کمزوری یہ بھی تھی کہ انہیں اپنی تعریف ہر درجہ پسند تھی۔ ہر اس شخص کے حسن گفت گو کے گرویدہ ہو جاتے اور اسے جان سے عزیز رکھتے جو ان کی مبالغہ آمیز تعریف کرتا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر نرگسی رجحان رکھتے تھے۔ ایک روز جب وہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ کی تیاری میں انتہائی مصروف تھے اور دوست احباب سے ملنا موقوف تھا اور میٹنگ کا وقت قریب تھا کہ اچانک اسی لمحے سفید فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف گودام کیپر کی اسامی کے ایک امیدوار حضرت مدہوش مدھو پوری نے اپنے تخلص کی مانند مدہوش ترنم میں اپنی نو تصنیف مسدس سنانی شروع کی تو پروفیسر صاحب میٹنگ ہی بھول گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ''مسدس کے ابتدائی بند انہی کی مدح میں تھے۔'' اس مدح میں مداح نے اس قدر غلو سے کام لیا تھا کہ الامان۔ یہ تو بھلا ہو فون کا کہ بیس منٹ بعد خود بخود خراب ہو گیا ورنہ پروفیسر صاحب تو ابھی تک مدہوش مادھو پوری کی مدہوش و مترنم آواز میں مسدس ہی سن رہے ہوتے۔

پروفیسر صاحب کی ایک خوبی یا خامی 'آپ جو بھی کہہ لیں' یہ تھی کہ پروفیسر دل کے بڑے نرم تھے۔ کسی کو روتا نہ دیکھ سکتے تھے۔ جس سے ان کے انسانی ہمدردی کے جذبات کا احساس ہوتا ہے لیکن صنف مخالف (یوسفی کے الفاظ میں 'صنف لاغر') کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی رحم دل واقع ہوئے تھے۔ میری معروضات کی توثیق کے لیے یوسفی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو، واقعہ یہ ہے کہ جب آنسہ سمنتا فرزوق (مدیرہ بازیچہ اطفال) کی فرمائش پر مصروفیات کے باعث انٹرویو سے ٹال مٹول کرنے لگے تو محترمہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر آئے 'پھر کیا ہوا یوسفی کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

''پروفیسر کو عورت کے آنسوؤں کی ذرا سہار نہیں' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عورت کی کسی
چیز کی سہار نہیں۔ چنانچہ طے پایا کہ پروفیسر تین کاک ٹیل پارٹیاں لشتم پشتم بھگتا کر

ساڑھے سات بجے تک ان کے گھر پہنچ جائیں گے۔''

پروفیسر قاضی عبدالقدوس طبعاً آزاد رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ زندگی میں جاہ و حشمت کے طلب گار تو تھے۔ لیکن غم روزگار سے ہلکان ہونا انہیں پسند نہ تھا۔ وزیراعظم بننا فقط اس لیے پسند تھا تاکہ ذہنی سکون، فرصت اور مالی آسودگی حاصل کر سکیں۔ کام کرنے سے انھیں کوئی رغبت نہ تھی۔ اگر انہیں کام کرنا پڑ جاتا تو ان کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی اور بوکھلا جاتے :

''پروفیسر کی بوکھلاہٹ سے ان کی عظیم ذمہ داریوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ اور ان عظیم صلاحیتوں کا بھی جن کے بغیر وہ بخوبی گزارہ کر رہے تھے۔ حواس مختل، زبان کھچڑی، لب ولہجہ اکھڑا اکھڑا۔ وہ تو پیدا ہی آرام کرنے کے لیے ہوئے تھے، کام کرنے سے تو ان کی حالت پتلی ہو جاتی اور وہ قاضی عبدالقدوس سے کاضی عبدل کدس بن جاتے۔''

یوسفی کا یہ طویل اقتباس پروفیسر قاضی عبدالقدوس کی شخصیت کی نفسیاتی تحلیل کے حوالے سے کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آزاد رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان میں ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی در حقیقت صلاحیت و قابلیت ہی نہیں۔ انہیں جب کبھی کام کرنا پڑ بھی جائے تو ان کے نہ صرف حواس جواب دے جاتے ہیں۔ بلکہ دل و دماغ بھی ساتھ دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ ان کی حالت اس قدر پتلی ہو جاتی ہے کہ اپنا نام تک صحیح طور پر نہیں بتا پاتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذہنی و اعصابی طور پر انتہائی کمزور شخصیت کے مالک ہیں اور کئی نفسی الجھنوں کا شکار ہیں۔

پروفیسر صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شعر و شاعری کے رسیا ہیں۔ ان کے شعر و شاعری کے شغف اور آرام طلبی کی عادات کا ذکر کر کے دراصل یوسفی نے ہماری معاشرتی و تہذیبی زندگی کے زوال کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ہم بحیثیت قوم آرام طلب ہو چکے ہیں، دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔ وہ تمام شغل اختیار کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں جن میں ہمیں ذہنی وجسمانی طور پر کسی قسم کی مشقت نہ اٹھانا پڑے۔ یہ ہمارے معاشرتی زوال کی نشانی ہے۔

شعر و شاعری کا حد سے زیادہ شوق بھی معاشرتی زوال کا ایک اہم پہلو ہے۔ اگر ہم میرؔ و غالبؔ کی دلی اور ناسخؔ و آتشؔ کے لکھنو کو یاد کریں تو اس دور میں ہر سو شعر و شاعری کا دور دورہ تھا اور لوگ دیگر صحتمند سرگرمیوں اور فکرِ دنیا میں سر کھپانے کے بجائے ہر پل شاعری سے شوق فرماتے تھے۔ سیاسی و سماجی اور معاشرتی و اقتصادی لحاظ سے یہ ہمارے تنزل کا دور تھا۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس بارے مرزا کہتے ہیں کہ پروفیسر عبدالقدوس اپنی دانست میں کوئی بہت ہی دانائی کی بات کہنے کے لیے اگر بیچ میں بولیں تو بیوقوف معلوم ہوتے ہیں۔ اگر نہ بولیں تو اپنے چہرے کے نارمل ایکسپریشن کے سبب اور زیادہ بیوقوف لگتے ہیں۔ گویا ''گویم مہمل و گرنہ گویم مہمل۔''۔ پروفیسر مذکور کے نارمل ایکسپریشن سے مراد چہرے پر وہ رنگ ہیں جو اس وقت آتے اور جاتے ہیں جب کسی کی زپ ادھ بیچ میں اٹک جاتی ہے۔ پروفیسر کے خاکے میں یوسفی نے مرزا کی زبانی 'پروفیسروں' کا مضحکہ کچھ ان الفاظ میں اڑایا ہے:

''معاف کیجیے 'اس خاکے میں ہم انہیں پروفیسر ہی کہیں گے' بہ قول مرزا آدمی ایک دفعہ پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے خواہ بعد میں سمجھ داری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔''

سلمان اظہر جاوید یوسفی کے دو مرکزی کرداروں 'مرزا' اور 'پروفیسر قاضی عبدالقدوس' کی حس مزاح اور طبع کا موازنہ کرتے ہوئے رائے دیتے ہیں :

''مرزا دوسروں کو مزاح کا نشانہ بناتے بھی ہیں اور خود نشانہ بنتے بھی ہیں لیکن یوسفی کا ایک اور کردار بجائے خود مزاح کا موضوع ہے 'خوجی' جیسا۔ اس کردار کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی نے خود ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ : پروفیسر عبدالقدوس ظریف نہ سہی ظرافت کے مواقع ضرور فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اس کردار کی معصومیت بڑی لاجواب ہے۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ سلیمہ صدیقی کے سکندر کی طرح یہ باتیں کر رہا ہے۔ سلیمہ صدیقی کا 'سکندر' ہے بھی نچلے طبقے کا غیر تعلیم یافتہ۔ اس کے منہ سے ایسی باتیں کبھی کبھار سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اس لیے اس قدر تعجب نہیں ہوتا لیکن پروفیسر عبدالقدوس ایم اے بی ٹی گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ اس لیے ان کا مزاح طرفگی کا حامل ہو جاتا ہے، سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔''

جب کہ ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے میں :

''مرزا اور پروفیسر عبدالقدوس 'یوسفی کے دو ایسے کردار ہیں جن میں خوجی اور حاجی بغلول کی سی شدت یا چچا چھکن کا سا نیم مضحک انداز تو نہیں ہے لیکن اس کے باوجود یہ دونوں انسان اور معاشرے کی مستقل حماقتوں اور عالمگیر ناہمواریوں کی علامت بن کر ہمارے اعصاب پر اس طرح چھا گئے ہیں جس طرح یوسفی نے انہیں اپنے خانہ دل میں مکین بنایا ہے۔''

یوسفی کے مزاح کا ایک اور نمائندہ کردار آغا تلمیذ الرحمن چاکسوی ہیں۔ ان سے ہماری ملاقات 'چراغ تلے' کے مضمون 'یادش بخیریا' میں ہوتی ہے۔ یوسفی اسے بے تکلفی سے 'آغا' کہہ کر پکارتے ہیں۔ آغا شدید ماضی پرستی (NOSTALGIA) کا شکار ہے۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی رجحان ہے جس میں مریض اپنے ماضی کی خوشگوار و ناخوشگوار یادوں میں مبتلا ہو کر حال میں ماضی کو تلاش کرتا ہے۔ ناسٹلجیا خصوصاً ماضی کی ان خوش گوار یادوں کا نام ہے جن سے حال میں مسرور ہوا جا سکے۔

حال کی ناآسودگی سے تنگ آکر ماضی کی طرف سفر کرنے کی خواہش جب شدت اختیار کر جائے اور انسان ماضی کی خوشگوار یا ناخوشگوار یادوں میں وقت گزارنے میں راحت محسوس کرے تو اس کیفیت کو ناسٹلجیا کا نام دیا جاتا ہے۔ ناسٹلجیا عام سطح پر ایک مثبت قدر ہے اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ حال کی کربناکیوں، الجھنوں، دکھوں، المیوں اور غموں سے کچھ دیر کے لیے ہی سہی فرار کا ایک ذریعہ ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

''ناسٹلجیا ایک مثبت طرز احساس ہے۔ ناسٹلجیائی یادیں کبھی جدا نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ یہ فطرت انسانی کا خاصا ہے۔''

تاہم ناسٹلجیا کا حد سے بڑھا ہوا رجحان انسانی شخصیت کے منفی رخ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے اور اس مرض میں مبتلا مریض کا کوئی حال نہیں ہوتا، اسے حال سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ حال کے ہر واقعے کو ماضی کے ترازو میں تولتا ہے۔ گویا ماضی اس کے لیے گوشہ مسرت (IVORY TOWER) ہوتا ہے۔ خود یوسفی ناسٹلجیا کے بارے میں لکھتے ہیں :

''ماضی گیراں (بروزن ماہی گیراں) ماضی کو پکڑ کر بیٹھ جانے والے لوگ تمنائی۔
پاستاں طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤس رقص دیدنی ہوتا ہے۔ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل بھی خود پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ناسٹلجیا اس لمحۂ منجمد کی داستان ہے۔''

یوسفی کے تخلیقی شاہکار ''آغا تلمیذ الرحمن چاکسوی'' کا ناسٹلجیا بھی اسی لمحہ موجود کی داستان معلوم ہوتا ہے۔ آغا ہر لحاظ سے ماضی کے اتھاہ سمندر میں سرتاپاڈوبا ہوا ہے۔ وہ لمحہ موجود کے ہر عمل کو ماضی کی عینک سے دیکھتا ہے۔ آغا کا یہ رجحان کوئی مثبت عمل نہیں بلکہ شخصیت کے مریضانہ رخ کو پیش کرتا ہے۔ یوسفی نے اس کردار کے بعض سوانحی کوائف اور نفسی رجحانات سے بھی ہمیں آگاہ کیا ہے جو اس کی شخصیت کے نفسیاتی تار و پود کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ آغا اپنی ذات میں انجمن تھے۔ کم آمیز تھے۔ ہر کس و ناکس سے نہیں ملتے تھے بلکہ اپنے بچپن کے ساتھیوں میں سے بھی کسی کسی کو ہی ملتے۔ بقول یوسفی:

''آغا اپنے بچپن کے ساتھیوں کے علاوہ، جواب ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، کسی سے نہیں ملتے۔ انہوں نے اپنی ذات ہی کو انجمن خیال کیا۔ ہم نے کبھی انھیں نشہ کرتے نہیں دیکھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کبھی جوان نہیں ہوتے۔ ان کی ساری جوانی قطعی فرضی تھی۔ ماضی کے نشہ میں سرشار ہو کر خوب بہکتے۔ نہ جانے کیوں اور کیسے انھیں یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ حوا کی ساری نسل انہی کی گھات میں بیٹھی ہے۔ آغا نے بچپن اور جوانی میں بجز شطرنج کے کوئی کھیل نہیں کھیلا۔

حد یہ کہ جوتے کے تسمے بھی کھڑے کھڑے اپنے نوکروں سے بند ھوائے۔ مگر جونہی بچپن کے پیٹے میں آئے، اس بات سے بڑے رنجیدہ رہنے لگے کہ اب ہم تین قسطوں میں ایک بیٹھک نہیں لگا سکتے۔ انہوں نے اپنی ذات کے علاوہ کبھی کسی کو گزند نہیں پہنچایا۔ گو آغا تمام عمر رہین ستم ہائے روزگار رہے لیکن چاکسو کی یاد سے ایک لحظہ غافل نہیں رہے۔ چنانچہ ان کی میت آخری وصیت کے مطابق سات سو میل دور چاکسو خورد لے جائی گئی اور چاکسو کلاں کی جانب پاؤں کر کے اسے قبر میں اتارا گیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ جنت میں بھی خوش نہیں ہوں گے اور یادش بخیر کہہ کر جنتیوں کو اسی جہان گزراں کی داستان پاستاں سنا سنا کے للچاتے ہوں گے جسے وہ جیتے جی دوزخ سمجھتے رہے۔''

یہ ہے مختصر ترین الفاظ میں ان کی سوانح عمری جس میں بقول یوسفی سوانح کم اور عمر زیادہ ہے۔ یہ مختصر ترین سوانحی تفصیلات بھی ان کی شخصیت کے بعض اہم نفسی رجحانات کو سمجھنے میں انتہائی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ژونگ کے نظریہ شخصیت کے مطابق وہ دروں بیں تھے۔ اپنی ہی ذات کو انجمن سمجھتے تھے۔ کم آمیز تھے، کم گو تھے، ہر کسی سے گھلتے ملتے نہیں تھے۔ یوسفی کا یہ جملہ ''انہوں نے اپنی ذات کے علاوہ کبھی کسی کو گزند نہیں پہنچایا'' اس کی شخصیت کے ایک ابنارمل رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ Masochist رجحان رکھتے تھے۔

آغا کی زندگی کو اگر کسی ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وہ لفظ یقیناً ''ماضی پرستی'' ہو گا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا، چلنا پھرنا، سانس لینا سب ماضی میں تھا۔ انھیں حال سے کوئی غرض وغایت نہیں تھی۔ یہی شدید ماضی پرستی ان کی شخصیت کے ابنارمل پہلو کو سامنے لاتی ہے۔ وہ ایک لحاظ سے نفسیاتی تنہائی کا شکار تھے؛ وہ اس بات کے قائل

تھے کہ مل کر بچھڑنے کی اذیت برداشت کرنے سے بہتر ہے کہ پرانے دوست احباب یا ہمدم دیرینہ سے بھی نہ ملا جائے۔ ذوق نے تو کہا تھا:

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحاؤ خضر سے

تاہم آغا اس بات کے قائل تھے کہ:

''مل کر بچھڑنے میں جو دکھ ہوتا ہے، وہ ذرا دیر مل بیٹھنے کی وقتی خوشی سے سات گنا شدید اور دیر پا ہوتا ہے اور وہ بیٹھے بٹھائے اپنے دکھوں میں اضافہ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔''

گویا وہ ساحر لدھیانوی کے اس شعر کی عملی تفسیر تھے:

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

آغا کی شخصیت کا مرکز و محور ماضی پرستی ہے۔ ان کے نزدیک نہ صرف دنیا کی تمام تر ترقی بلکہ اردو میں بھی جو کچھ لکھا جانا تھا آج سے پچیس سال قبل لکھا جا چکا تھا۔ آغا کی شخصیت کا المیہ یہ ہے کہ ان کی زندگی ایک نقطے پر آکر ساکن ہو گئی تھی اور وہ نقطہ تھا ''ماضی پرستی''۔ ماضی کی اندھی تقلید کرتے تھے اور ہر شے، ہر کردار اور ہر خیال کو ماضی کے آئینے میں رکھ کر دیکھنے کے عادی۔ اپنے مزاج اور موقف کے خلاف بات سننے کے عادی نہیں تھے۔

جو وہ کہتے، اسے ہی درست خیال کرتے اور پھر اس پر ڈٹ جاتے۔ آغا کی ان ہی عادات نے انھیں مضحک کردار بنا دیا ہے۔ ان میں کوئی لچک نہیں ہے۔ وہ اپنے زمانے سے لطف اندوز ہونے اور جدید ایجادات اور علوم و خیالات سے مستفید ہونے کے بجائے مہابلی اکبر کے عہد کو یاد کر کر کے روتے ہیں۔ ان کے بارے میں یوسفی نے کی رائے یہ ہے کہ وہ اگر جنت میں بھی ہوں تو بھی اس میں خوش نہیں رہ سکتے بلکہ جنت کی نعمتوں سے مسرور ہونے کے بجائے اس دنیا کی یاد میں آنسو بہائیں گے '' جسے وہ جیتے جی دوزخ سمجھتے رہے۔'' آغا کے ناسٹلجیائی سوچ کے عکاس اور یوسفی کے مزاح سے بھرپور چند جملے ملاحظہ کیجیے:

☆ سامنے دیوار پر آغا کی ربع صدی پرانی تصویر آویزاں تھی جس میں وہ سیاہ گاؤن پہنے، ڈگری ہاتھ میں لیے، یونیورسٹی پر مسکرا تھے۔ (چراغ تلے، 50)

☆ نئے شاعروں کو ریڈیو سیٹ پر بھی ہوٹ کرنے سے باز نہیں آتے۔ (ص 51)

☆ آغا کو بھی اپنے ماضی بعید سے 'خواہ اپنا ہو یا پرایا' والہانہ وابستگی تھی جس کا ایک ثبوت ان کی 1927ء ماڈل کی فورڈ کار تھی جو انہوں نے 1955ء میں ایک ضعیف العمر پارسی سے تقریباً مفت لی تھی۔ (ایضاً، ص 53)

(آغا کی فورڈ کار پطرس بخاری کے مزاحیہ مضمون ''مرحوم کی یاد میں'' کی سائیکل کی یاد دلاتی ہے)

☆ جہاں کوئی چیز 'کوئی نئی صورت نظر پڑی اور انہوں نے کچ کچا کے آنکھیں بند کیں اور یاد رفتگاں کے اتھاہ سمندر میں غڑاپ سے غوطہ لگایا۔ کہیں کوئی بات بار خاطر ہوئی اور

انہوں نے ''یادش بخیر'' کہہ کر بیتے سمے اور بچھڑی ہوئی صورتوں کی تصویر کھینچ کے رکھ دی۔ (ایضاً، ص 54)

☆قدیم نصاب تعلیم کے وہ بے حد معرف و مداح تھے۔ اکثر کہتے کہ ہمارے بچپن میں کتابیں اتنی آسان ہوتی تھیں کہ بچے تو بچے' ان کے والدین بھی سمجھ سکتے تھے۔ (ایضاً، ص 56)

☆گزشتہ مارچ میں آغا ایک مدت مدید (تیس سال) کے بعد اپنے گاؤں گئے۔ لیکن وہاں سے لوٹے تو کافی آزردہ تھے۔ انہیں اس بات سے رنج پہنچا کہ جہاں پہلے ایک جوہڑ تھا جس میں دن بھر بھینسیں اور ان کے مالکوں کے بچے پڑے رہتے تھے' وہاں اب ایک پرائمری سکول کھڑا تھا۔ (ایضاً، ص 58)

☆آغا کی عمر کا بھید نہیں کھلا۔ لیکن جن دنوں میرا تعارف ہوا' وہ عمر کی اس کٹھن گھاٹی سے گزر رہے تھے جب جوان ان کو بوڑھا جان کر کتراتے اور بوڑھے کل کا لونڈا سمجھ کر منہ نہیں لگاتے تھے۔ جن حضرات کو آغا اپنا ہم عمر بتاتے رہے' ان میں سے اکثر ان کو منہ در منہ چچا کہتے تھے۔ خیر ان کی عمر کچھ بھی ہو مگر میرا خیال ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کبھی جوان نہیں ہوتے۔ (ایضاً، ص 59)

☆دوسری خانہ بربادی کے بعد شادی نہیں کی' اگرچہ نظر میں آخری دم تک سہرے کے پھول کھلتے اور مہکتے رہے۔ یوں ترنگ میں ہوں تو ہر عاقل و بالغ خاتون میں اپنی اہلیہ کی صلاحیت نظر آتی تھی۔ (ایضاً، ص 60)

مرزا ماضی کے نشہ سے سرشار ہو کر خوب بہکتے۔ اپنے آپ پر سنگین تہمتیں لگاتے اور عورت ذات کو نقصان پہنچانے کے ضمن میں اپنے 55 سالہ منصوبوں کا اعلان کرتے جاتے۔ ماضی بارے آغا کی رائے یہ تھی:

''آغا نے یک لخت ماضی کے مرغزاروں سے سر نکال کر فیر کیا۔'' یادش بخیر کی بھی ایک ہی رہی۔ اپنا تو عقیدہ ہے کہ جسے ماضی یاد نہیں آتا کہ اس کی زندگی میں شاید کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن جو اپنے ماضی کو یاد ہی نہیں کرنا چاہتا وہ یقیناً لوفر رہا ہوگا۔''

یہ تو تھیں یوسفی کے چند اہم کرداروں کی باتیں، ان کے علاوہ بھی یوسفی نے بہت سارے کردار تخلیق کیے ہیں۔ یہ سب کردار کئی مشترک خصوصیات رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ اور منفرد ہیں اور کرداروں کی بھیڑ میں دور سے پہچانے جاتے ہیں۔

افسانے

نیلوفر اقبال

کرسٹل ہاؤس

اس جوڑے میں کوئی خاص بات تھی، جو انہیں پہلی نظر دیکھنے میں دوسروں سے کچھ ہٹ کر اور منفرد بناتی تھی۔ وہ انسانوں سے زیادہ پرندوں کا جوڑا نظر آتے تھے۔ دونوں کی جسامت ایک جیسی تھی۔ گورے رنگ، اکہرے بدن، کچھ کچھ آگے کو جھکے ہوئے، چہرے نوکیلے اور ناکیں پرندوں کی چونچوں کی طرح سامنے سے جھکی ہوئیں۔ جیسے وہ فرسٹ کزن ہوں۔ ہو بھی سکتے تھے۔ اور نہیں بھی۔ ممکن ہے کہ ہمہ وقت ساتھ رہنے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے سے مشابہت اختیار کر گئے ہوں۔ یہ جوڑا اس لیے بھی سب کی نظروں میں آتا تھا کہ روزانہ ٹھیک شام کے پانچ بجے وہ اکٹھے بلا ناغہ واک پر نکلتے تھے۔ عورت عموماً سفید ٹراؤزر اور پھولدار شرٹ میں ہوتی۔ آدمی بلیک ٹریک سوٹ اور سفید جوگرز میں ہوتا۔ دونوں کے ہاتھ میں چھڑی ہوئی۔ وہ چھڑی کو ٹیکتے نہیں تھے بس چلتے وقت آگے پیچھے جھلاتے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ دونوں اپنے ساتھ چھڑی کیوں رکھتے تھے۔ ممکن ہے ماضی میں کبھی ان پر کسی کتے نے حملہ کر دیا ہو یا جنگلی سوروں کا جتھا کبھی ان کا رستہ کاٹ گیا ہو اور وہ حفظ ماتقدم کے طور پر چھڑی ساتھ رکھتے ہوں۔ بہر حال یہ ان کا اسٹائل تھا۔ سلور گرے بال اور چھڑی ان پر خوب جچتے تھے۔

اس پورے علاقے میں ان کا گھر بھی دوسرے تمام گھروں کی نسبت بہت جاذب نظر اور باقی گھروں کی نسبت ممتاز نظر آتا تھا۔ یہ گھر اٹالین طرز تعمیر پر بنایا گیا تھا۔ باہر سے سینڈ سٹون (SandStone) سے مزین تھا اور کھڑکیاں کچھ ایسے بنی تھیں کہ اندر سل پر رکھی خوبصورت سجاوٹی اشیاء باہر دکھائی دیتی تھیں۔ اس گھر کی چھت پر سبز کھپریل تھی۔ ایک جانب گھر کی پوری سائیڈ آئیوی (Ivy) سے ڈھکی تھی جسے نفاست سے کھڑکیوں کے چاروں اطراف سے تراش دیا گیا۔ لان کے گرد دیوار بھی آئیوی سے ڈھکی تھی اور اتنی نیچی تھی کہ لان باہر سے پوری طرح دکھائی دیتا تھا اور وہ اس علاقے کا دلکش ترین لان تھا اور مکینوں کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کرتا تھا۔ اسلام آباد کا پرانا سیکٹر ہونے کی وجہ سے یہ گھر پرانے اور گھنے پھولدار درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ سبز مخمل کی سی نفیس گھاس کارپٹ کی صورت لان میں بچھی تھی۔ موسمی پھولوں کے علاوہ یہ لان نادر قسم کے پودوں اور پیڑوں سے بھی مزین تھا۔ پھر ایک خاص چیز وہ چھوٹی سی ندی (Stream) تھی جو لان کے ایک طرف بنی ہوئی راکری (Rockery) تک جاتی تھی۔ اس سٹریم کے اوپر پانی لکڑی سے بنا خم کھایا ہوا چھوٹا سا پل تھا۔ اس پل کے پہلو میں ہی سرخ اور سفید دھاریوں والی خوبصورت چھتری کے نیچے چار کرسیوں کا سفید گارڈن سیٹ رکھا تھا۔ اس پر عام طور پر تو کوئی چائے پیتا نظر نہ آتا تھا لیکن کبھی کبھار جب ان کے بچوں میں سے کوئی آیا ہوتا تو لان میں خوب چہل پہل ہو جاتی اور اکثر شام کو یہ لوگ اسی میز پر چائے پیتے نظر آتے۔

اکثر جب ان کی دبئی والی بیٹی آئی ہوتی، لان میں رنگوں کے جھماکے سے ہوتے رہتے۔ اس کی سہیلیاں

ملنے آتیں اور وہ لان میں ٹہلتی رہتیں یا چائے پیتیں۔ وہ دور سے بالکل انگریز نظر آنے والی خوبصورت لڑکی تھی جو زیادہ تر جینز اور ٹاپ میں نظر آتی۔ اس کے سنہرے رنگے ہوئے بال لہراتے رہتے۔ فلپینو میڈ اس کے دو گورے گورے گول مٹول بچوں کے ساتھ لان میں بال کھیلتی یا انہیں ایک طرف نصب جھولوں اور سی۔سا (See-Saw) پر لے جاتی۔ اکثر وہ بچے لکڑی کے پل پر چڑھتے، اترتے رہتے یا چھوٹے سے سفید Pomeranian کتے سے کھیلتے رہتے۔

کبھی کبھی اس لان میں بہت بڑی گارڈن پارٹی ہوتی۔ پودوں اور پیڑوں کے اندر سے ننھی ننھی بتیوں کی روشنی جھلملاتی۔ راکری میں نصب آبشار چالو کر دی جاتی۔ جس کے نیچے سنگ مرمر کا کائی زدہ Nude مجسمہ خوب مزے لے لے کر نہاتا۔ کیٹرنگ باہر سے کروائی جاتی۔ اکثر باربی کیو ہوتا۔ پاس پڑوس کے گھروں سے کسی کو مدعو نہ کیا جاتا۔ البتہ باربی کیو سے اٹھنے والا خوشبودار دھواں ان گھروں میں در آتا اور کراکری اور کانچ کی کھنک اور مہمانوں کے مہذب قہقہے کھڑکیوں کے راستے ان گھروں کے مکینوں تک پہنچ جاتے۔ وہ اپنی کھڑکیوں سے جدید ترین تراش خراش کے ملبوسات اور خوبصورت رنگوں کے جھماکے دیکھ پاتے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان پارٹیوں میں مدعو ہونے والے لوگ کون ہوتے تھے اور کہاں سے آتے تھے۔ سڑک باہر تک گاڑیوں سے بھر جاتی تھی۔ مہمان آدھی رات کے قریب رخصت ہوتے تھے۔

گو اس گھر میں ان ہمسائیوں میں سے کوئی کبھی بھی مدعو نہ ہوا تھا۔ لیکن ان کے بارے میں ایک ایک بات مع ضروری و غیر ضروری جزئیات ہر ایک کو معلوم تھی اور اس جانکاری کا ذریعہ ڈومیسٹک سٹاف (DomesticStaff) تھا۔ ماسیاں تھیں جو پولن زدہ مکھیوں کی طرح گھر گھر بیج پھینکتی تھیں۔ پھر ڈرائیور اور سکیورٹی گارڈز تھے جو رات گئے مل بیٹھتے اور ہر قابل ذکر یا نا قابل ذکر خبر کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ پھر ان کوٹھیوں کی اس لین میں ایک چاق و چوبند بوائے کٹ ہیئر سٹائل والی مسز شمسی تھیں جو کسی این جی او سے منسلک تھیں۔ صرف وہی تھی جو اس کوٹھی کی مالکن خاتون سے تعارف رکھتی تھیں۔ چونکہ وہ خاتون خود بھی اپنے وقت میں باوجود زیادہ وقت دوسرے ممالک میں رہنے کے خواتین کی تنظیموں کی فعال رکن رہ چکی تھیں لہذا مسز شمسی کسی نہ کسی طرح ان سے منسلک ہو چکی تھیں اور ان کی ڈنر پارٹیوں کے مدعوین کی لسٹ میں ان کا نام بھی تھا۔ انہی مسز شمسی نے اسی لین کے رہنے والے دوسرے گھروں سے بھی اچھے سوشل مراسم رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے انکا آنا جانا باقی کوٹھیوں کے فنکشنوں میں بھی تھا۔ جیسے کوئی ون ڈش پارٹی، میلاد یا ختم قرآن، جب میلاد یا ختم قرآن کا اختتام ہو جاتا اور عورتوں کے کھانے پینے کا دور شروع ہو جاتا تو اکثر عورتیں آہستہ آہستہ کھسکتیں مسز شمسی کے قریب پہنچ جاتیں جو کہ اچھی Conversationalist تھیں۔ بات کئی متفرق موضوعات سے ہوتے ہوئے لامحالہ اس کوٹھی کے مکینوں تک جا پہنچتی اور یوں پاس پڑوس والیاں کچھ نہ کچھ کرید لینے میں کامیاب ہو جاتیں۔

مسز شمسی سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ یوں تھیں۔ صاحب خانہ فارن سروس سے ریٹائرڈ تھے۔ سروس کے دوران دنیا کے بیشتر ممالک میں پوسٹنگ کے سلسلے میں رہ چکے تھے۔ لیکن ریٹائرمنٹ سے قبل مستقل رہائش کے لیے انہوں نے اسلام آباد میں یہ گھر تعمیر کروایا تھا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان سب کو امریکہ اور انگلینڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دلوائی تھی۔ اب دو بیٹے امریکہ میں سیٹل تھے۔ بیٹی شادی کر کے دبئی

جا چکی تھی۔ بیٹے سال میں ایک بار اکثر کرسمس کے مہینوں میں آتے تھے۔ بیٹی البتہ اکثر آجاتی رہتی تھی۔ گرمیوں میں یہ لوگ اپنے بچوں کے پاس امریکہ چلے جاتے تھے لہٰذا تنہائی انکے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہ تھی۔ اپنی دنیا اور زندگی میں مگن تھے۔ جب یہ لوگ اپنے بچوں کے پاس رہنے جاتے تھے، آس پاس والوں کو خبر ہو جاتی تھی۔ پورچ میں کھڑی گاڑیوں پر ترپال ڈال دی جاتی، لان میں خزاں رسیدہ پتے ڈھیریوں کی صورت جمع ہونے لگتے اور کبھی زور کی ہوا چلتی تو لمبی ڈرائیو وے پر زرد زرد پتے آپس میں ریس لگاتے۔ دبیز پردوں سے ڈھکی کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا ہوتا۔ صرف سکیورٹی گارڈ کے گیٹ کے ساتھ کونے میں بنے چھوٹے سے کمرے میں بتی روشن رہتی۔ مر سم سرما سے پہلے چہل پہل پھر واپس آجاتی۔ پورچ میں چم چم کرتی دھلی دھلائی گاڑیاں نظر آنے لگتیں خاکروب چابکدستی سے ڈرائیو وے صاف کرتے۔ لمبی سفید پائپ کی مدد سے گھر کے چاروں اطراف کو دھویا جاتا۔ مالی ہمہ تن لان کی آرائش میں مصروف دکھائی دینے لگتا۔ اس طرح سب کو پتہ چل جاتا کہ صاحب خانہ آنے والے ہیں۔ پھر دو چار دن کے بعد کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے سے جھلکتی روشنی بتا دیتی کہ وہ واپس آ چکے ہیں۔

جس چیز نے اس لین کے دیگر مکینوں کا تجسس اس کوٹھی کے بارے میں بڑھا رکھا تھا، وہ اس کوٹھی کی اندرونی آرائش کے بارے میں داستانیں تھیں۔ ان داستانوں کی راوی مسز شمسی کے سوا کون ہو سکتی تھی۔ ان کے کہنے کے مطابق یہ گھر کیا تھا عجائب خانہ تھا۔ دنیا بھر کے نوادرات خاص کر کرسٹل اس گھر میں جمع تھا۔ کرسٹل کی ایسی ایسی خوبصورت مصنوعات اس گھر میں جمع تھیں جو بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ فارن سروس میں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے اور گھومنے پھرنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں میاں بیوی میں خوبصورت اشیاء خاص کر کرسٹل جمع کرنے کا ذوق خبط کی حد تک موجود تھا۔ فرانس، اٹلی، بلجیم، جاپان غرضیکہ جہاں جہاں پوسٹنگ رہی یا یونہی سیر کے لیے گئے وہاں سے خوبصورت ترین اور بیش قیمت سجاوٹی اشیاء لائے اور اپنے گھر میں سجائیں۔ کئی شوکیس، میزیں، پیڈیسٹل، گھر کے کونے حتیٰ کہ سیڑھیاں بھی ان چیزوں سے مزین تھیں۔ دنیا بھر سے جمع کی گئی پینٹنگز اس کے علاوہ تھیں۔ شوق صرف چیزیں جمع کرنے اور سجا دینے کی حد تک نہ تھا بلکہ ان کی صفائی اور حفاظت بھی بہت لگن اور توجہ سے کی جاتی تھی۔ ایک نوکر دن رات صرف اسی کام کے لیے مامور تھا۔ وہ ہمہ وقت ڈسٹر اور سپرے وغیرہ سے لیس صفائی ستھرائی یا پالش میں لگا رہتا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام اشیاء ہر وقت جگمگ جگمگ کرتی رہتیں۔

مسز شمسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جس دن گھر میں ڈنر پارٹی ہوتی ہے، اکثر مہمان گھر کا ایک طرح سے گائیڈڈ ٹور بھی لے لیتے ہیں۔ بلکہ جو پہلے بھی دیکھ چکے ہوتے وہ بھی شوقیہ ساتھ ہو لیتے کہ ان اشیاء میں ہمہ وقت اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ کچھ چیزیں ایسی تھیں کہ دیکھنے والے کا سانس اوپر نیچے رہ جاتا تھا۔ خاص کر کونوں میں کھڑے قد آدم جاپانی گلدان جن پر بنے خوش رنگ نقش و نگار اور چرند پرند اور مناظر کی دلکش تصاویر انسان کو حیرت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ پھر لکڑی کی مصنوعات، آبنوسی مجسمے، بیمبو کی بنی ہوئی اشیاء ہر سائز کی جاپانی گڑیاں، مختلف طرز کے فاونٹینز (Fountains) غرضیکہ گھر کیا تھا حیرت کدہ تھا۔ ملنے جلنے والے اسے ''کرسٹل ہاؤس'' کے نام سے پکارتے تھے۔

مسز شمسی کی باتیں سن کر اکثر سننے والوں کا دل چاہتا کہ وہ بھی اس ''حیرت کدہ'' کو اندر سے دیکھ پاتے۔

لیکن چونکہ ان لوگوں کو تو اس گھر میں ہونے والی پارٹیوں میں کبھی ایک بار بھی مدعو نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا ان کی عزت نفس اجازت نہ دیتی تھی کہ بن بلائے اور بلا تعارف محض گھر دیکھنے پہنچ جاتے۔ اس لیے مسز شمسی سے سنی ہوئی باتوں سے ہی تجسس کی تشفی کر لیتے۔۔۔ لیکن ایک دن ایسا ہوتا ہے جب بلا مدعو کیے کسی کے گھر بھی جایا جا سکتا ہے اور ''کرسٹل ہاؤس'' میں بھی وہ دن آ گیا۔

موسم بہار کا آغاز تھا۔ کچھ دن سے اس کوٹھی کا مالی بڑی مستعدی سے اندر باہر موسم بہار کے پھولوں کی ننھی ننھی پنیریاں تازہ تیار کی ہوئی کیاریوں میں بوتا نظر آ رہا تھا۔ اچانک صبح صبح اس لین کی تمام کوٹھیوں میں خبر پھیل گئی کہ ''کرسٹل ہاؤس'' کے صاحب خانہ کا اچانک رات کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے بیٹوں کی امریکہ سے آمد کا انتظار کیا جائے گا۔ تدفین دو روز بعد اتوار کو ہو گی۔

اس دن کرسٹل ہاؤس کے باہر لین سے لے کر ڈبل روڈ تک ان گنت گاڑیاں تھیں۔ چند رشتہ داروں نے فوری طور پر انتظام سنبھال لیا تھا۔ اس لیے شامیانہ، کرسیاں، چادریں و دیگر انتظام کر لیا گیا۔ سہ پہر تک ان کی بیٹی بھی دبئی سے آ گئی تھی۔ آج اس گھر میں وہاں کی پارٹیوں میں مدعو ہونے والے لوگوں کے علاوہ آس پاس کی کوٹھیوں میں رہنے والے ہمسائے بھی آنے والوں میں شامل تھے۔ گھر کی مالک سادہ سے سلیٹی لباس میں سیاہ چادر سر کے اوپر اوڑھے لاؤنج میں ایک کرسی پر سر نیہواڑے خاموش بیٹھی تھیں۔ کچھ ایسے جیسے بیمار پرندہ گردن گرا دیتا ہے، ملنے والیاں اور رشتہ دار خواتین آتیں اور قریب آ کر گلے لگتیں۔ آہ وزاری اور رونے کی کچھ آوازیں بلند ہوتیں۔ پھر آنے والی کوئی نہ کوئی جگہ دیکھ کر بیٹھ جاتی۔ اور خاموشی چھا جاتی۔ یہ سوال ہر آنے والے کے ذہن میں تھا کہ یہ خاتون اتنے بڑے گھر میں اپنے شوہر کے ہمراہ رہتی تھی۔ کوئی تیسرا نہ تھا۔ اب یہ کیا کرے گی۔!

کچھ پہلی بار آنے والوں کی نظریں گھر میں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ لیکن گھر اپنی آرائش کی پہلی والی صورت میں تھا ہی نہیں۔ مجسموں اور بڑی بڑی سجاوٹی اشیاء کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان پر سفید چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ فرنیچر گھسیٹ کر دیواروں کے ساتھ لگا دیا گیا تھا تاکہ آنے والوں کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔ لاؤنج کے وسط میں نصب فاؤنٹین بھی بند تھا۔ اس میں کہنی کے بل نیم دراز وNude مرمیڈ(Mermaid) پر کسی نے سفید چادر ڈال رکھی تھی۔ البتہ شوکیسوں میں سجی کرسٹل کی اشیاء بدستور جگمگا رہی تھیں۔ لیکن یہ موقع نہ تھا کہ نظروں سے بھی تحیر اور ستائش کا اظہار کیا جا سکتا۔ اس لیے جنہیں تجسس تھا وہ خاموشی سے اور چپکے چپکے چور نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں۔ پورے ماحول پر اس گردن گرائے پرندہ نما عورت کی دلگرفتگی کا سایہ پڑا ہوا تھا۔ جیسے ہر شے اس کے لیے معنویت کھو بیٹھی ہو۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر اچانک سامنے خلاء میں دیکھتی جیسے کسی آنے والی شے سے معصوم حیرت کے ساتھ پوچھ رہی ہو۔ ''میرے ساتھ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد اس لین کی کوٹھیوں میں سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ''کرسٹل ہاؤس'' بکنے والا ہے۔ ان کے بیٹے پاکستان میں دو ہفتے سے زیادہ نہ رہ سکتے تھے۔ انہیں فوری طور پر اپنی اپنی جاب پر واپس پہنچنا تھا لہٰذا تمام فیصلے بجلی کی تیزی سے کرنے پڑے تھے۔ کرسٹل ہاؤس کی مالکن کو اپنے بیٹے کے ہمراہ امریکہ جانا تھا۔ جہاں انہیں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہائش اختیار کرنی تھی جو شادی شدہ تھا۔ چھوٹا بیٹا ہنوز کسی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور کیمپس میں رہائش پذیر تھا۔ ہر سننے والے کے ذہن میں ایک ہی سوال اٹھ رہا تھا کہ یا خدا، اتنے ساز و سامان کا کیا ہو گا۔ مسز شمسی روزانہ اس گھر میں آنا جانا کر رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ خاتون تو بہت کچھ اپنے

ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ کارٹن بنا کر Ship کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن بیٹے نے سختی سے منع کر دیا کہ وہاں اکوموڈیشن کم ہوتی ہے۔ اس کی امریکن بیوی اتنا Clutter پسند نہیں کرے گی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ اچھی فطرت کی مالک تھی اور اپنے شوہر کی ماں کو تنہا چھوڑنے پر اس کا دل نہیں مانا تھا اور وہ ساتھ رکھنے پر بخوشی تیار ہو گئی تھی۔۔۔ پھر بھی کچھ یادگار چھوٹی چھوٹی چیزیں انہوں نے بکسوں میں گھسائی تھیں اور ایک آدھ چھوٹا سا کارٹن بھی بنالیا تھا اور بس۔

عورتیں کرید کرید کر گھر کی مالکن کے دل کے اندر کا حال پوچھتی تھیں یا دوسرے الفاظ میں یہ جاننا چاہتی تھیں کہ آخر اتنے بے پناہ چاؤ اور لگن سے دنیا بھر سے اکٹھی کی ہوئی اشیاء سے جدائی کو آخر وہ خاتون کس طرح لے رہی ہیں۔ وہ اپنے تجسس کی تشفی چاہتی تھیں۔ بے رحمانہ تشفی جو کہ مسز شمسی نے نہایت تسلی بخش انداز میں کر دی۔ ہاں وہ اپنی کسی چیز سے جدا نہ ہونا چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا کوئی ایش ٹرے بھی ایسا نہ تھا کہ جس سے اسے لگاؤ نہ تھا اور جیسے وہ بخوشی چھوڑ دیتی۔ وہ تو ہر چیز ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اس پر خاصی بحث ہوئی تھی۔ اس کے بچوں کو اسے بہت سمجھانا بجھانا پڑا تھا۔ لوگ تو ایک موت مرتے ہیں لیکن وہ عورت تو کئی کئی موتیں مر رہی ہے۔ ہر شے سے تو اسے پیار تھا۔ ہائے ہائے!

کرسٹل ہاؤس کی تمام نادر اور بیش قیمت اشیاء کو نیچے لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں رکھ دیا گیا تھا۔ ان پر پرائس Tags لگ گئے تھے۔ خود مسز شمسی نے کچھ پینٹنگز، کینڈل سٹینڈ اور کرسٹل کے گلدان خریدے جو تقریباً ایک تہائی قیمت پر بکے تھے۔ پھر انہوں نے فون کر کے دوسری کوٹھیوں کی خواتین کو بھی اکسایا کہ وہ اگر کچھ لینا چاہتی ہیں تو آدھی یا ایک تہائی قیمت پر بہت کچھ مل رہا ہے۔ البتہ چند نادر اور قیمتی اشیاء ان کی بیٹی نے چھانٹ کر اپنے ساتھ دبئی لے جانے کے لیے الگ کر لی تھیں۔ انہیں بڑے بڑے کارٹنوں میں پیک کیا جا رہا تھا۔ مسز شمسی کے کہنے پر دوسری خواتین نے بھی ہمت کی۔ کوٹھی کے لاؤنج میں ایک سرخ چہرے والا صحت مند ٹھیکیدار نما شخص ان اشیاء کو دکھانے اور بیچنے کا کام کر رہا تھا۔ چیزوں میں زیادہ قیمتی اور غیر معمولی اشیاء تو ان کی پارٹیوں میں مدعو ہونے والے متمول دوستوں نے ہی خرید لی تھیں۔ آس پاس کی خواتین بھی اب گلدان، ایش ٹرے اور لیمپ وغیرہ جیسی چیزیں اٹھائے کوٹھی کے گیٹ سے نکلتی نظر آتی تھیں۔ پھر بے شمار برینڈڈ امپورٹڈ کراکری تھی جس کا کسی بڑی کراکری شاپ والے نے اکٹھا سودا کر لیا تھا۔ تمام فرنیچر ایک استعمال شدہ فرنیچر میں ڈیل کرنے والے شوروم کے مالک نے اٹھوا لیا تھا۔ گھر والے چونکہ رات کی کسی فلائٹ سے گئے تھے۔ لہٰذا کسی نے انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چند روز بعد کوٹھی پر پینٹ پالش کرنے والے کام کرتے دکھائی دے رہے تھے جن کی نگرانی سرخ چہرے والا ٹھیکیدار قسم کا آدمی کر رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ کرسٹل ہاؤس کے سامنے ForSale کی تختی لٹک رہی تھی۔ یہ تھی ''کرسٹل ہاؤس'' کی کہانی۔

نگین خالد

ان وردی (Unworthy)

کافی دنوں سے مجھے یہ پریشانی کھائے جا رہی تھی کہ ابا جی کو کیا ہو گیا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ابھی قریباً ایک مہینہ پہلے تک تو بھلے چنگے تھے۔ کھاتے پیتے ہنستے بولتے۔ گھر میں رونق انھیں کے دم سے تو تھی ورنہ ہم تو دن بھر کے تھکے ہارے گھر لوٹتے تو یوں بستر پر گر پڑتے جیسے کوئی محاذ سر کر آئے ہوں۔ ابا جی گورنمنٹ سکول ٹیچر تھے۔ پچھلے پینتیس برس سے ایک ہی سکول سے منسلک ہونے کی بدولت اس سکول سے ایک خاص لگاؤ اور انسیت رکھتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سکول انھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا۔ شب و روز کی محنت سے اسے سنوارا تھا۔ اپنی آنکھوں سے اسے تل تل بڑھتے دیکھا تھا۔ ابا جی بتایا کرتے کہ جب ان کی سلیکشن بطور استاد گورنمنٹ پرائمری سکول سیال میں ہوئی تب اس کی عمارت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سکول میں گنتی کے طالبعلم تھے۔ ابا جی کے علاوہ ایک اور استاد ماسٹر حمید وہاں کا کل سٹاف تھے۔ وہ بچوں کو لے کر ایک درخت تلے بیٹھ جاتے اور اتنے ذوق و شوق سے پڑھاتے کے گرمی سردی تک کا احساس بھول جاتے۔ ان کا کہنا تھا کہ بیٹا میں بچوں کو پڑھاتا نہیں بلکہ ان میں پڑھنے کا شوق پیدا کرتا ہوں۔ بچوں کو کتابیں رٹا دینا معرکہ نہیں بلکہ اصل محاذ تو یہ ہے کہ استاد ان میں علم کی جستجو پیدا کر سکے۔

ابا جی دھان پان سے آدمی تھے مگر ان کی شخصیت بہت بارعب تھی۔ وہ بیک وقت سنجیدہ طبیعت بھی تھے اور خوش مزاج بھی۔ زندگی میں اگر ان کے لیے کوئی چیز سب سے زیادہ اہم تھی تو ان کی عزتِ نفس، عزت اور خودداری پر انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کبھی کبھی تو ہمیں فرق کرنا مشکل ہو جاتا کہ ان میں خودداری زیادہ تھی یا انا۔ بہن بھائیوں میں ابا جی سب سے بڑے تھے۔ انھوں نے ساری زندگی دادا جی کے اس فرمان پہ عمل کیا کہ انسان بڑا اپنی عمر یا قد سے نہیں ہوتا بلکہ عمل ہوتے ہیں جو انسان کو بڑا بناتے ہیں۔ دادا کی زندگی میں ہی انھوں نے گھر کی سب زمہ داریاں اپنے سر لے لیں تھیں۔ بہن بھائیوں کے لیے ہمیشہ شجرِ سایہ دار رہے دادا جی کہا کرتے تھے کہ شاہد حسین (ابا جی) میرا سب سے قابل بیٹا ہے اور یہ سن کر ابا جی کا سینہ فخر سے اور چوڑا ہو جاتا۔ دادا جی بتاتے تھے کی اپنے بچپن سے ہی ابا جی کے اندر سنجیدہ اور زمہ دار انسان کی خوبیاں اجاگر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ کیا ہمسائے کیا رشتہ دار سبھی ان کو بہت عزت دیتے۔ کوئی مسئلہ آن پڑتا یا کوئی فیصلہ لینا ہوتا تو ابا جی سے مشورہ لینا ضروری سمجھا جاتا۔ اس اپنائیت و محبت نے ابا جی کو بے پناہ اعتماد بخشا تھا۔ وہ میٹرک پاس پی ٹی سی استاد تھے مگر قابلیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ جب ہمیں اپنے بچپن جوانی اور سکول سے متعلق واقعات سناتے تو ان کی آنکھوں میں ایک فاتح کی چمک ہوتی۔ ان کی گفتگو کا جوش دیدنی ہوتا جب وہ بیان کرتے کے کیسے گورنمنٹ پرائمری سکول سیال کو انھوں نے پرائمری سے مڈل اور پھر ہائی کے درجے پر پہنچایا۔ وہ 1983ء سے 1993ء

تک سکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ 1993ء میں ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے انھیں سینٹر ہیڈ کا اضافی چارج دے دیا گیا۔ جس کے تحت انھیں 10 سکولوں کا نگران بنایا گیا۔ انھوں نے اس عمدگی سے فرائض نبھائے کہ آج بھی ان سکولوں کے سٹاف میں سے کوئی کہیں راہ میں مل جاتا تو نہایت تپاک سے ملتا۔ اباجی نے نہایت شان و شوکت والا دور جیا تھا۔ اب کچھ سالوں سے جب سے محکمہ تعلیم میں نت نئے تجربات ہونے شروع ہوئے اساتذہ کا سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔ طالبعلموں کے لیے ''مار نہیں پیار'' کا نعرہ لگ رہا تھا اور سب سزائیں استاد کے لیے مقرر کر دی گئی تھیں۔ طالبِ علم استاد کے مقام و مرتبہ سے نابلد ہوتے جا رہے تھے۔ اباجی کو یہ سب بہت ناگوار گزرتا۔ وہ اکثر اس بات پہ کڑھتے کہ اب جو پالیسیاں رائج ہیں وہ استاد اور طالبعلم کے رشتے کو کمزور کر رہی ہیں۔

اباجی کا سکول جب پرائمری سے مڈل ہوا تب سکول میں نئے ہیڈ ماسٹر صاحب کا تعین ہوا جو SST تھے۔ اباجی PST ہونے کی وجہ سے مڈل سکول کے ہیڈ نہیں رہ سکتے تھے۔ جس سکول کو انھوں نے اولاد کی طرح پالا تھا اس کا سربراہ کوئی اور مقرر ہو نا یقیناً اباجی کے لیے دکھ کی بات تھی مگر انھوں نے خندہ پیشانی سے نئے سربراہ کو خوش آمدید کہا۔ نئے ہیڈ اباجی کی قابلیت اور انتظامی امور میں مہارت کو دیکھتے ہوئے ہر معاملے میں ان سے مشورہ لیتے۔ جب سکول کو مڈل سے ہائی کا درجہ تفویض ہوا تو اباجی کی خوشی دیدنی تھی۔ اتنی خوشی تو انھیں شاید بھائی کے CSS پاس کرنے یا میرے ایم-اے انگریزی میں ٹاپ کرنے پر بھی نہیں ہوئی تھی۔ سکول کو ھائی کا درجہ ملنے پر تو اباجی نے شکرانے کے نوافل ادا کیے اور مٹھائیاں تقسیم کیں۔ بس گھی کے چراغ جلانے ہی باقی تھے۔ سکول کے نئے ہیڈ پبلک سروس کمیشن کے منتخب شدہ تھے۔ مگر سکول کے انتظامی امور میں جو تجربہ اور بچوں سے جیسا لگاؤ اباجی کو تھا وہ کسی اور میں کہاں تھا۔ نئے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اباجی سے بہت سے معاملات سیکھتے اور ان کی رائے کو اہم گردانتے۔ سکول کے تمام تعمیراتی و ترقیاتی کام اباجی کے سپرد تھے۔ سکول میں داخلوں کا آغاز ہوا تو یہ کام بھی ہر سال کی طرح اباجی کے سپرد تھا۔ ان کی تعلیمی قابلیت اگرچہ اتنی نہ تھی کہ وہ نئے نصاب کے تقاضوں کو پورا کر سکتے لہذا انھوں نے نرسری جماعت کی انچارج شپ لے لی کیونکہ چھوٹے بچوں کا تعلیمی نصاب کچھ زیادہ مشکل نہ تھا اور اباجی کو یہ ہنر آتا تھا کہ کیسے چھوٹے بچوں کو سکول سے مانوس کرنا ہے کہ وہ گھر جانے کی ضد کو بھول کر کھیل کھیل میں ہی کافی کچھ سیکھ بھی جائیں۔ سکول کے لیے شبانہ روز محنت نے ان کو گویا وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ پچپن برس کی عمر میں پچھتر کے لگنے لگے تھے۔ ہمارے بہتیرا کہنے کے باوجود اپنی صحت سے زیادہ کام کو ترجیح دیتے۔ اگرچہ اب وہ پہلے سی چستی تو باقی نہ رہی تھی لیکن کام سے لگن اب بھی ویسی تھی۔

یہ غالباً مئی کے شروع کے دن تھے جب ایک دن اباجی گھر آئے تو کھوئے کھوئے سے تھے۔ خلافِ معمول کھانا کھائے بغیر ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں کھانے کی ٹرے لے کر کمرے میں گیا تو کہنے لگے بھوک نہیں مجھے۔ سونا چاہتا ہوں۔ ان کے لہجے میں ایسی سختی تھی کہ میں مزید کچھ کہے بغیر واپس مڑا۔ مجھے آواز دے کے روکا اور پوچھنے لگے کہ اسد یہ unworthy کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ میں نے فوراً اپنی علمیت جھاڑتے ہوئی جواب دیا"نااہل"۔ اباجی کے چہرے پر کرب کی ایک لہر آکر گزر گئی۔ کہتے ٹھیک ہے جاؤ تم۔ مجھے آرام کرنے دو۔ بھائی اور امی نے بھی جا کے پوچھا کہ طبیعت ٹھیک نہیں لگتی آپ کی۔ چلیے ڈاکٹر کو دکھا آتے ہیں۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ رات کو کھانے کے بعد واک سے واپس آئے تو بجائے ہماری پاس بیٹھنے کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اگلے کافی دن یہی معمول

رہا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ابا جی کا یہ بجھا بجھا سا رویہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ابا جی ایسے انسان تو ہر گز نہ تھے کہ کوئی پریشانی ہوتی یا کوئی مسئلہ ہوتا تو اسے اپنے اوپر اس طرح طاری کر لیتے کہ گھر والوں سے ہی کٹ کر رہ جاتے۔ انھوں نے زندگی میں بڑے بڑے مسائل کو نہایت خندہ پیشانی اور اعلیٰ فہمی سے حل کیا تھا۔ ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ سب کے ساتھ بیٹھنا ہنسنا بولنا چھوڑ دیا تھا۔ ہم تو ترس گئے کہ ان کے سکول کے قصے سننے کے لیے۔ بھائی ضد کر کے انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے مکمل چیک اپ کے بعد کہا کہ کوئی سیریس مسئلہ نہیں۔ کمزوری کی وجہ سے ایسا ہے۔ کچھ وٹامن لکھ دیے۔

ایک دن میں آفس جانے لگا تو دیکھا ابا جی ابھی تک اپنے کمرے میں کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا آپ سکول نہیں گئے آج؟ ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ ابا جی چھٹی کرتے۔ بولے کام تھا کچھ اس لیے چھٹی کی۔ میری حیرت ابھی بھی کم نہ ہوئی تھی۔ کام کی نوعیت دریافت کی تو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ ابا جی ریٹائرمنٹ کی فائل تیار کر رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ ابا جی تو سکول سے الگ ہونے کے تصور سے ہی غمزدہ ہو جایا کرتے تھے ملازمت کے پانچ سال رہتے ہی ریٹائرمنٹ کی فائل تیار کر رہے تھے۔ وجہ جاننا چاہی تو بس اتنا کہا کہ بہت تھک گیا ہوں اب، آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میرا دل اس وجہ کو ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ ضرور کوئی بات ہے جو ابا جی چھپا رہے ہیں۔ کوئی ایسا راز جو انھیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ میں آج ہی آفس وقت نکال کے ابا جی کے سکول جاؤں گا اور حمید صاحب سے جاننے کی کوشش کروں گا کہ کیا کوئی سکول سے متعلق پریشانی ہے جو ابا جی کو تکلیف دے رہی ہے۔ ابھی آفس میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ گھر سے کال آنے لگی۔ بھائی کا فون تھا۔ ابا جی کو ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ میں اسپتال پہنچا تو ابا جی جا چکے تھے۔ یہ صدمہ اتنا گہرا تھا کہ اس سے باہر آنا ناممکن لگ رہا تھا۔ روز آفس سے آ کر میں ابا جی کے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ ان کی استعمال شدہ چیزوں کو چھو کر ابا جی کے لمس کو محسوس کرتا۔ ایک خلش تھی دل میں کہ میں یہ بھی نہ جان سکا کہ ابا جی کے دل پہ پر کس بات کا غم اس قدر بھاری بیٹھ گیا کہ دل ہی بند ہو گیا۔ ایک دن ابا جی کی الماری کھولی تو وہی ریٹائرمنٹ والی فائل نظر پڑی جو میں نے آخری بار ابا جی کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ کھول کے دیکھنے لگا تو سب سے اوپر ہی ایک فوٹو کاپی شدہ صفحہ نظر آیا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ سکول کی لاگ بک کا کاپی شدہ صفحہ ہے۔ جس پر DMO کی طرف سے یہ تحریر درج تھی:

“Mr. Shahid hussain is unworthy to teach and to control the class.He should be given retirement from his services as soon as possible” DMO

غزلیات

احمد رضا

غزل

حریمِ شوق میں کھولا کسی نے غرفۂ شوق
چمک اٹھے ہیں در و بام ہائے خانۂ شوق

وہ روبرو ہے مگر کم سخن ہے دیدۂ شوق
مری نگاہ میں حائل ہے شاخسانۂ شوق

تری دھنک سے فروزاں ہے میرا موجۂ رنگ
تری نگاہ سے چلتا ہے کارخانۂ شوق

نگار خانۂ لیل و نہار سے آگے
چمک رہا ہے تری یاد میں ستارۂ شوق

مگر یہ دیدہ و دل مستفید ہو نہ سکے
کھلا پڑا تھا مرے سامنے نوشتۂ شوق

حسین شاہ زاد

غزل

میں یوں تو دفعتاً یکتائی کا قضیہ بنا ہوں
مگر لانبا ہے وہ عرصہ کہ جس میں طے ہوا ہوں

میں ایسے خواب کے برزخ کا قیدی ہوں کہ جس میں
کوئی راہِ فرار آئے تو فوراً جاگتا ہوں

مجھے بے کار حرف و صوت میں کھوجا گیا ہے
میں ڈے ژا وُو ہوں اور احساس پر افشا ہوا ہوں

مجھے چالاکیوں نے فلسفے میں لاکھ ڈھونڈا
مگر میں سادہ دل کے عجز میں چھپ کر رہا ہوں

مرے چرچے کو مشکل استعارے کس لیے ہیں
میں تتلی ہوں، میں بھنورا ہوں، میں گل ہوں، میں صبا ہوں

مجھے ملنا ہے تو سطروں کے بیچوں بیچ ڈھونڈو
میں جملہ ختم ہو جانے پہ دل میں بولتا ہوں

یہ باتیں ہر جگہ، ہر وقت کی رمزیں ہیں شہ زاد
تمھیں سننا نہیں آتا ہے، میں تو کہہ رہا ہوں

ضمیر قیس

غزل

پھیر کے کنڈل گیش میں دل، درویش کا کنگھا ناچے
لہکے ، مہکے جوبن ، یوون جب ست رنگا ، ناچے

میں نے وَیل سے مَیل کو دھویا، غَیب سے عَیب کو تو نے
تجھ میں جمنا رقص کرے تو مجھ میں گنگا ناچے

گیان دھیان سے بات ذات کو سیخ ، چیخ کر جس میں
بلھا۔۔ 'من جا'۔۔ لفظ پروئے ، مرشد۔۔ 'چنگا ناچے'

گولی جھولی کھول کے بولی من آشا کی بھاشا
مہندی والی تلیوں پر ہے لوکھن زنگا ناچے

جگ مگ کرتے لگ بھگ سب جگ ڈگمگ چلتے جائیں
ڈگ ڈگ گائے فتنہ کوئی پگ پگ دنگا ناچے

پل پل دم دم زم زم سی ٹپ ٹپ کرتی اک بارش
سوکھے روکھے اندر گرتی چھاچ ، ملنگا ناچے

آنکھیں موندیں بوندیں کیوں کر لاج اناج نہ گوندھیں
دھرتی مرتی کرتی کیا جگ جس پر ننگا ناچے

بھیتر بھینچے نفس کا دھندہ مندہ گندا پھندا
تِترّ ، بتّر کرتا پھرتا ڈاکو رنگا ناچے

سُن گن ، دُھن ، پُن ، چُنتی سُنتی کن کی ہر مریادا
قیس کنارے چاک پدھارے یا بے ڈھنگا ناچے؟

عابد علی

غزل

اِن رستوں کے ٹیڑھے میڑھے دیکھے ہیں کرتوت!
اب باتوں سے نہیں مانیں گے یہ لاتوں کے بھوت

دو ہونٹوں کی چپ نے دیکھا منظر معنی خیز
بات اُٹھا کر لاتی ہے خاموشی کا تابوت

کہتی ہے بینائی کی اَن دیکھی دستاویز
ان آنکھوں کو دینا ہوں گے نَم کے اور ثبوت

ڈھلتے جسم پہ اُٹھتی جھریاں لگتی ہیں نوخیز
کتنی ہمت والا ہے یہ جیون کا شہتوت

تم تو شہزادی ہو تمھارا نام ہے دلآویز
کیسے چھو سکتے ہیں تم کو ہم گمنام اچھوت

گلناز کوثر

غزل

آخر اک دن جان سے چمٹا روگ مٹے گا روتے دھوتے دل سے لپٹا غم جائے گا
کٹتے کٹتے سانس کی ڈوری کٹ جائے گی بہتے بہتے درد کا دریا تھم جائے گا

شہزادے کی پتھر آنکھ سے ٹوٹا آنسو دھک دھک کرتے ننھے دل میں پھیل رہا ہے
آج بھی برفیلی وادی سے دھوپ بھری بستی کی جانب ایک پرندہ کم جائے گا

الجھی سلجھی ایک کہانی چلتے چلتے آخری موڑ پہ ٹھہر گئی ہے سوچ رہی ہے
کوئی نیا کردار کہاں سے کس منظر میں اترے گا اور کون بہ چشمِ نم جائے گا

گرتی پڑتی پگ ڈنڈی پر ہارے ہوئے قدموں سے کوئی دور تلک چلتا جاتا ہے
منظر ڈھل جائے گا لیکن وقت کی آنکھ میں جلتا بجھتا گھائل لمحہ جم جائے گا

ایک صدی تک نیند میں ڈوبے شہر کے برجوں میناروں پر راج رہے گا سناٹے کا
ایک صدی تک گلیوں، سڑکوں، دیواروں سے چلتی ہوا کا جھونکا بھی مدھم جائے گا

نظمیں

ازہر ندیم

خمارِ جاں گواہی دو

(اختر حسین جعفری کی نذر)

خمارِ جاں! بدن کے پار بھی اترو
نگارِ دل! لکھو وہ داستاں پوری
کہ جس کے حرف پھیلے ہیں مکاں سے لامکانی تک
کسی آغاز کا نقطہ ابد کی سمت کو سوچے
یہ میرے خواب کے موسم
زمین و آسماں کی وسعتوں سے بھی کہیں آگے
ٹھکانا ڈھونڈ کر آئیں
ہوا رنگوں سے یوں کھیلے
فضا کے کینوس پر خواہشوں کے پھول کی بیلیں
کناروں سے کناروں تک پرندوں کو لبھاتی ہوں
خیالِ یار کی ساری لطافت کائناتی جسم میں دھڑکے
کسی لمحے کے کوزے میں یہ دریائے زماں سمٹے
مسافت ختم ہو میری
درِ تکمیل کھلتا ہو
خمارِ جاں، گواہی دو
خمارِ جاں، بدن کے پار بھی اترو!

خوش بخت بانو

قبر کی ایک رات

مجھے رات کے درمیانی حصے میں
ایک خواب کے ہمراہ دیکھ لیا گیا تھا
اور مجھ سے وہ سوالات پوچھے گئے
جو قیامت کے روز پوچھے جانے چاہئیں تھے
واویلا ہوا
چند فرشتے آئے
جن کی ہوس بھری نظروں سے چھپنے کے لیے
حوریں قبر میں اترنے کو تیار ہیں
قبر کی تلاشی لی گئی
ایک کونے میں تنہائی پڑی تھی
فرش پر میری پگھلی ہوئی آنکھیں
جگہ جگہ وحشت بکھری پڑی تھی
ان کے ہاتھ پر مایوسی کے جالے لگے
خدا نے میری آبرو رکھ لی

سرمد سروش

مرے بعد جانے کیا ہے

مرے بعد کچھ نہیں ہے
مرے بعد ختم شد ہے
مرے پیچھے آنے والا
مرا ہم سخن نہیں ہے
کوئی اور آدمی ہے
مرے عہد کی کہانی
کو زوال آ چکا ہے
مری داستاں کے ہیرو
سرِ راہ مر گئے ہیں
سیہ شب گزر رہی ہے
نیا دن نکل رہا ہے
دو زمان مل رہے ہیں
بڑی مضطرب فضا ہے
وہ جو تھی مری نیابت
اسے پیش انقضا ہے

وہ جو مجھ کو سن رہا تھا
وہ جو مجھ کو دیکھتا تھا
وہ خدائے لم یزل تھا
وہ جو ان پہ ہے مسلط
وہ خدائے کیمرا ہے
سو جو انفرادیت تھی
ابھی ہے ابھی نہ ہو گی
یہ ذرا سی رستگاری
مرے بعد پھر نہ ہو گی
مرے بعد جانے کیا ہے
نہ بشر ہے نہ خدا ہے
میرے بعد ختم شد ہے

....

سید کاشف رضا

طوطے

انیبا نے کہانی میں بتایا ہے
کراچی میں کبھی طوطے ہوا کرتے تھے
اس کے آسمانوں پر
ہرے تاروں کی صورت جگمگاتے تھے
سمندر کے قریں جھیلیں ہوا کرتی تھیں
ڈملوٹی میں کنویں تھے
منڈیریں تھیں
ملیر اک جنتِ ارضی ہوا کرتا تھا
اس کے ٹاپوؤں پر زندگی پرواز کرتی تھی
جزیرے پانیوں میں لہلہاتے تھے
اور ان پر سبز طوطے پھڑ پھڑاتے تھے

مجھے طوطے ہمیشہ سے
عجب اک جادوئی مخلوق لگتے ہیں
میں طوطا دیکھتا تو سوچتا تھا
جانے اس میں کون سے جن یا دیو کی جان ہو گی
اور ان کی ناک والی لڑکیاں بھی
مجھ کو پریوں کی کہانی سے چلی معلوم ہوتی تھیں

مری بھی جان تھی اک سبز طوطے میں
جو میرے سبز پرچم کی فضا میں پھڑ پھڑاتا تھا
میں اُس کے ساتھ جیتا تھا

میں اُس کے ساتھ مرتا ہوں

فہیم جوزی

ملاپ

سورج تمھاری بھووؤں کے درمیان اک چمکتا نقطہ ہے
تمہارے رخساروں سے پھوٹتی ہے شفق
رات کی رانی نے چرائی ہے
تمہارے لبوں کی دبازت
تمہاری آنکھوں میں ڈولتے ہیں
محبت کے ابد
بادلوں کو رنگ دیا ہے
تمھاری سنولاہٹوں نے

تمھارے سلاویا میں ہے
آبِ زمزم کی پاکیزگی

اور تمھارے ساقیں کو چھو کر
بحرالکاہل انگڑائیاں لیتا ہے

تراجم

کیتھرائن ٹائنن
ترجمہ: کاشف شاہ

The flower of Youth

جوانی کا پھول

مبادا جنت میں خاکستری داڑھیوں والوں کا مجمع لگ جائے
خدا، جس نے اپنی تفریح کے لئے نوجوان لڑکے بنائے
عظمت اور اداسی والے دن اترتا ہے
اور اُن کو پاس بلاتا ہے
پاس بلاتا ہے راتوں میں سے

اور جب وہ فوجی دستوں کی صورت میں جنگ سے آتے ہیں
تو ہمارے آسمانوں پر بیشمار نئے سنہرے ستارے نمودار ہو جاتے ہیں

اور جنت بے فکر اور خوش نما چہروں سے بھر جاتی ہے
المناک خوابوں سے تازہ جاگے ہوئے
وہ سبز اور خوشنما جگہوں میں گھومتے ہیں
شفاف پانی کے چشموں کے قرب و جوار میں
وہی جنہوں نے خواب میں مرنا اور کٹنا دیکھا
اور شدید پیاس اور عظیم درد دیکھا

پیارے لڑکو! وہ ہمیشہ جوان رہیں گے
خدا کا بیٹا بھی کبھی ایک لڑکا تھا

وہ شفاف دریا کے پانیوں میں اٹکھیلیاں کرتے ہیں اور اپنی جوانی کے مزے لیتے ہیں
خدا، جس نے لڑکوں کو ستھرا اور اچھا بنایا، مسکراتا ہے پدرانہ آنکھوں سے

....

جنت پہ نوجوانوں کی یلغار ہو چکی ہے
اور ان کے قہقہے خدا کے گھر میں گونجتے ہیں
خدا ان کے دلوں کو بے نقص رکھتا ہے
جس نے ان کو بے داغ اور سادہ بنایا
عقل مند بزرگ ولی ان کو دیکھ کر مسکراتا ہے
"یہ کتنے نوجوان ہیں اور ان میں کوئی چالبازی نہیں"

آہ! اگر مرے ہوئے بیٹے کی گریہ کرتی ماں
اور بیوہ لڑکی دیکھ لے
اس عظمت کو
جس نے عظیم جنگ پہ جانے والوں اور وہاں مرنے والوں کو آغوش میں لیا
تو وہ اٹھ کھڑی ہو کر اپنا ماتم ترک کر دیں
اور کہیں: "خدا کا شکر، اس پہ عطا ہے۔"

فرانسس لیڈوِیج
ترجمہ: کاشف شاہ

A Soldier's Grave
ایک سپاہی کی قبر

اور پھر رات کی نیند آور خاموشی میں
مہربان بازوؤں نے آہستگی سے اسے اتارا
موت کی آغوش میں
تاکہ وہ دوبارہ سن نہ سکے
جنگ کے بدحواس الارم
مرتی ہوئی کراہیں
اور تکلیف میں ڈوبی سانسیں
اور جہاں زمین پھولوں کے لئے نرم تھی
ہم نے اس کی قبر بنائی
تاکہ وہ سکون سے سو سکے
بہار آئے گی اور اسے دلکشی سے سجائے گی
اور چنڈول یہیں پر اپنا شبنمی گھونسلہ بنائے گی

ولیم اورپن
ترجمہ: کاشف شاہ

The Church, Zillebeke, October 1918

چرچ زیلیبیک اکتوبر 1918ء

کیچڑ
ہر طرف
کچھ نہیں بس کیچڑ
ہوا کیچڑ میں لتھڑی ہوئی لگتی ہے
گھاس کے کچھ تنکے بھی اب کیچڑ میں لتھڑے ہیں
کیچڑ
چرچ کیچڑ کا ڈھیر بن چکا ہے
اس پہ نظر ڈالو اور رو لو
انہوں نے چرچ کو یہ بنا دیا ہے
کیچڑ
گیلا، چپکنے والا
گوندھا ہوا اور پھیلا ہوا
یہاں ہڈیاں جو کبھی معتبر تھیں
صلیبوں کے ساتھ بکھری پڑی ہیں
خستہ اور ٹوٹی ہوئی
کیچڑ میں دفن
یہیں پر
جہاں ہمارے دلیروں کے گرنے پہ چرچ کی گھنٹیاں بجتی تھیں
اس بے لگام دوزخ کے آغاز میں
کیچڑ
بس یہی کچھ بچ گیا ہے
کیچڑ

ٹام کیٹل
ترجمہ: کاشف شاہ

Betty, The Gift of God (To my daughter)
بیٹی؛ خُدا کا تحفہ (میری بیٹی کے لیے)

ہوش مند دنوں میں
میری محبوب کلی!
جب تم مغرور حسن سے چہچہا کر گلاب بن جاؤ گی
اپنی ماں کی جوانی کی طرح
اسی چہیتے، مؤخر، اور شاندار وقت میں
تم سوال کرو گی کہ میں نے تمہیں کیوں چھوڑا
اپنے اور اُس پیارے دل کو
جو تمہارے بچپن کا تخت رہا
موت کا جوا کھیلنے کے لئے

وہ تمہیں ترانے سنائیں گے
اور وجوہات بتائیں گے
جو کچھ لوگوں کے نزدیک ارفع ہوں گے
اور کچھ آگاہ لہجوں میں ان کو رد کریں گے
اور یہاں
جہاں پاگل بندوقیں ہمارے سروں کے اوپر سے لعنت برساتی ہیں
اور کیچڑ میں لتھڑے تھکے ہوئے آدمی
مسہری اور فرش کے لئے آہیں بھرتے ہیں
یہ جان لو کہ مردہ بیوقوفوں کے درمیان ہم بیوقوف
کسی جھنڈے کے لئے نہیں مرے
نہ ہی کسی بادشاہ یا سلطان کے لئے
بلکہ ایک خواب کے لئے
جو ایک چرواہے کے سائبان تلے پیدا ہوا
اور غریبوں کے خفیہ صحیفے کے لئے

خطوط

بنام مدیر
از: بابر حسین بابر

سرگودھا
11 نومبر 2021ء

السلام علیکم مدیر محترم!

زبان محض اظہارِ خیال کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ الفاظ کے صوتی اثرات، املا کی صورتیں بولنے والے کا لب و لہجہ، ذوقِ سماعت اور قارئین کی ذہنی سطح بھی کسی گفتگو یا تحریر کے موثر ہونے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان تمام عناصر کا لحاظ ہی بولنے والے یا لکھنے والے کے معیار کا تعین کرتا ہے۔

ہر زبان ارتقائی سفر طے کرتی ہے۔ پھلتی پھولتی ہے۔ اپنی جائے ظہور سے نکل کر دوسرے علاقوں میں جاتی ہے۔ مختلف انسانوں کے لہجے میں فرق، مقامی زبان کے الفاظ ل، مختلف علاقوں کی ادبیات اور اہلِ زبان کے ذوق میں فرق کسی زبان کے ارتقاء پر لازما اثر انداز ہوتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی زبان میں جو اضافہ ہوتا ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار کیا ہے؟ یہ سوال زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک طرف معیارِ سخن اور اہلِ زبان کا ادبی ذوق اس کے بنیادی اصولوں کی پابندی کو زبان کی حفاظت کے لیے ضروری سمجھتا ہے تو دوسری طرف تخلیقی ذہن اظہار و بیان کے نئے افق کی تلاش میں رہتا ہے۔

یہ دونوں کیفیات اور دونوں جذبے ہی قابلِ تحسین ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اول الذکر میں بنیاد پرستی اور تعصب اور موخر الذکر میں سستی اور کاہلی نہ ہو۔

مدیرِ محترم! آپ نے زبان کی استنادی حیثیت پر قلم اٹھا کر دونوں قسم کے خیالات میں ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک طرف تو آپ زبان کی درستی کے بنیادی اصولوں کی پابندی کو لازمی سمجھتے ہیں تو دوسری طرف زبان کے ارتقائی سفر میں کسی بے جا پابندی کے قائل نہیں ہیں لیکن یہاں بھی آپ زبان کے ارتقا کو عوم الناس کے سپرد نہیں کرتے بلکہ مایہ ناز شعراا ور ادباء کے کلام اور تحریروں کو ہی بنیاد بناتے ہیں۔

زبان کے ارتقا کے حوالے سے اس کی استنادی حیثیت پر کئی جہتوں سے بات کی جاسکتی ہے بالخصوص اردو کے اندر دیگر زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کی صلاحیت کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے ایک اور بڑی پتے جی بات کی ہے کہ زبان کی سرپرستی اربابِ اختیار کو کرنی چاہیے تھی لیکن اس نگر کے لوگوں نے اردو سے زیادہ انگریزی ہو اہمیت دی اس لیے زبان کے تحفظ وار تقاء کا سہرا ادیبوں اور شاعروں کے سر جاتا ہے۔ لیکن یہ اہم ترین بحث اس وقت صحیح معنوں میں مفید ثابت ہو سکتی ہے جب اس میں امثلہ کو بھی پیش کیا جائے۔ اگر مشکور بمعنیٰ شکر گزار مشہور ہو گیا ہے اور ناراضی اور درستی کی جگہ ناراضگی اور درستگی نے لے لی ہے تو پھر ان سب کو غلط کہنے پر اصرار نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ الفاظ تو دراصل معانی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہیں اور ان کا صوتی اثر فصاحت کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس لیے ایک

مشہور و مستعمل فصیح لفظ کو زبان کے تحفظ کے نام پر غلط قرار دے کر پرانے لفظ پر اصرار بذات خود ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔

امید ہے دائم صاحب! آپ اس سلسلے کو آگے بڑھائیں گے اور امثلہ کے ذریعے اس موضوع میں مزید وضاحت کریں گے۔

یہ بات بہر حال خوش آئند ہے کہ اس موضوع کے حوالے سے آپ کی فکر متوازن اور یہ کاوش لائقِ تحسین ہے۔

بابر حسین بابرؔ
بھیرہ شریف، سرگودھا